فہرست مضامین خلافت راشدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

حضرت ابوبکرؓ

۲ ربیع الاول ۱۱ھ ہجری تا ۲۲ جمادی الثانی ۱۳ھ ہجری
جون ۶۳۲ عیسوی تا اگست ۶۳۴ عیسوی

ہجرت کا گیارہواں سال تھا، ربیع الاول کی پہلی یا دوسری تاریخ تھی۔ دوشنبہ کا دن تھا

آنحضرت صلعم کی وفات

جب سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ ابھی فجر کی نماز کے وقت آپ کی بیماری میں افاقہ تھا۔ اور آپ نے بعض لوگوں سے کچھ باتیں بھی کی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ آپ کی حالت بہتر دیکھ کر اجازت لیکر اپنے اہل وعیال میں چلے گئے تھے۔ اس لئے بہت لوگوں کو یقین نہ آیا۔ کہ آپ فوت ہو گئے ہیں۔ اور حضرت عمرؓ نے خیال کیا کہ یونہی کسی منافق نے یہ خبر اڑا دی ہے۔ اور وہ مسجد میں تلوار لے کر کھڑے ہو گئے تا اس تشویشناک خبر کے پھیلانے سے روک دیں۔ حضرت ابوبکرؓ کو اطلاع ملی تو فوراً آئے اور حضرت عایشہؓ کے حجرے میں داخل ہو کر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو فوت ہوئے ہوئے دیکھ کر مسجد میں تشریف لائے اور اپنا مشہور خطبہ پڑھا الا من کان یعبد محمداً فان محمداً قد مات۔ اگر کوئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا تو آپ وفات پا گئے اب سب لوگوں نے یقین کیا کہ واقعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرما گئے۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا مشورہ اور حضرت ابوبکرؓ کی بیعت

ابھی حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ مسجد ہی میں تھے کہ ایک انصاری نے یہ خبر پہنچائی کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں (جو اہل مدینہ کے کونسل ہال کے طور پر تھا) جمع ہو کر امیر کے انتخاب کی تجویز کر رہے ہیں۔ موقعہ بہت نازک تھا۔

اگر انصار اپنی جگہ پر کسی امیر کا انتخاب کر لیتے جسے عرب کے لوگ قبول نہ کرتے تو اسلام کا اتحاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی پاش پاش ہو جاتا۔ اس لئے انصار کے مشورہ کی خبر سنتے ہی حضرت ابوبکر اور عمر اور ابو عبیدہ نے سقیفہ بنی ساعدہ کا رخ کیا۔ وہاں سعد بن عبادہ کی تقریر پر قریباً یہ فیصلہ ہو ہی چکا تھا کہ امیر سعد کو ہی منتخب کیا جائے۔ چنانچہ ان حضرات کے وہاں پہنچنے پر ایک انصاری نے انصار کے فضائل پر کچھ تقریر کی حضرت ابوبکر اُٹھے اور فرمایا کہ انصار نے دین اسلام کی جو خدمت کی ہے اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا اور وہ اپنی ان خدمات کی وجہ سے بیشک فضیلت رکھتے ہیں۔ لیکن ملک عرب سوائے قریش کے ایک بادشاہ پر راضی نہیں ہوگا۔ اور یہی بات درست بھی تھی۔ ملک عرب میں آج تک کسی قوم کو دوسری قوم پر بادشاہت حاصل نہ ہوئی تھی۔ لیکن اُن کے دلوں میں قریش کی خاص عزت تھی۔ اس لئے کہ وہ عرب کے روحانی مرکز خانہ کعبہ کے متولی تھے۔ اول تو اہل عرب کے خون کے اندر آزادی ایسی رچی ہوئی تھی کہ ان کے لئے ایک بادشاہ یا امیر کا تسلیم کرنا مشکل کام تھا۔ ہر قوم اپنی اپنی جگہ پر آزادی کی خواہاں رہتی تھی۔ اور اگر وہ سب کے سب کسی شخص کو امیر تسلیم کرنے پر متفق بھی ہوتے تو سوائے قریش کے اور کسی قبیلہ کے آگے سر تسلیم خم نہ کرتے اس لئے بھی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم قریش میں سے تھے۔ اور اس لئے بھی کہ قریش کو ملک عرب کی سب قوموں پر خاص امتیاز حاصل تھا۔ حضرت ابوبکر کی دور اندیشی نے اس بات کو سمجھ لیا تھا۔ اور یہی بات آپ نے انصار کے مجمع میں پیش کی۔ انصار کی طرف سے پہلے آپ کے جواب میں کہا گیا کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک آپ میں سے مگر اس سے اسلام کا اتحاد ٹوٹتا تھا۔ آخر بہت سی رد و قدح کے بعد انصار کو یہ بات سمجھ آگئی اور ان میں سے ایک شخص نے اُٹھ کر کہا کہ ہم نے محض حصول رضائے الٰہی کے لئے اپنی جانیں اور اپنے مال خدا کی راہ میں دیئے تھے۔ اور اب بھی اسلام کی بہتری کو مدنظر رکھکر ہم اس بات پر راضی ہیں کہ قریش میں سے امیر کا انتخاب ہو اور ہم جس طرح رسول اللہ صلعم کے مددگار اور معاون تھے اسی طرح آپ کے جانشین کے معاون رہیں گے اور حضرت ابوبکر کا ہاتھ پکڑ کر آپ کی بیعت کی اور بعض روایات میں ہے کہ پہلے حضرت عمر اور ابو عبیدہ نے آپ کی

بیعت کی۔ پھر انصار نے گروہ در گروہ آپ کی بیعت کی۔ صرف سعد بن عبادہ رہ گئے۔ بعد کے زمانہ میں حضرت عمر نے ایک دفعہ جب خود خلیفہ تھے یہ فرمایا کہ جو بات حضرت ابوبکر کو نصیب تھی وہ اور کسی کو نہیں ہو سکتی کیونکہ جس طرح کہ آپ کے سامنے سب کی گردنیں جھکتی تھیں اور کسی کے سامنے نہیں جھکتی تھیں۔

ابوبکرؓ و عمرؓ کی دور اندیشی

حضرت ابوبکر اور عمر کی دور اندیشی کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام ایک خطرناک مصیبت سے بچ گیا۔ ورنہ اگر وہ فوراً سقیفہ بنی ساعدہ میں نہ پہنچ جاتے اور اس سوال کو اپنی فراست صحیحہ سے اور اس نور سے جو اللہ تعالیٰ نے اُن کے سینوں میں روشن کیا تھا حل نہ کر لیتے۔ یہاں تک کہ سب لوگ اس بات پر متفق ہو گئے تو اسلام کو ایک ایسے اندرونی تفرقہ کا مقابلہ کرنا پڑتا جس کے ساتھ اس کی قوت کا وہیں خاتمہ ہو جاتا۔ بلاشبہ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین کا کام تھا اور وہ لوگ جنہوں نے چوتھائی صدی سے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو آپ پر قربان کر رکھا تھا جو ایک لمحہ کے لئے آپ سے علیحدگی کو گوارا نہ کر سکتے تھے ان کا دل یہی چاہتا تھا کہ آپ کی پیکر مبارک کو آخری آرامگاہ کیلئے اپنے ہاتھوں سے تیار کریں۔ لیکن اگر وہ اس کام میں لگ جاتے تو اسلام میں ایک ایسی سخت آگ مشتعل ہو جاتی جس کے ساتھ اسلام کا جنازہ ہی نکل جاتا۔ اس لئے انہوں نے اپنی خواہشات پر قومی ضرورت کو مقدم کیا۔ اور اسلام کی وہ خدمت کی جس کے لئے ہمیشہ ہر مسلمان ان کا مرہونِ منت رہے گا۔ جن لوگوں نے اس بنا پر ان حضرات کو ملزم کیا ہے۔ انہوں نے واقعات تاریخی کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر کے ایسا کیا ہے۔

فساد کی اس چنگاری کو بجھا دینے کے بعد جو خرمن اسلام کو جلا کر اس کا خاتمہ کر دیتی

حضرت ابوبکر کی بیعت اور آپ کا خطبہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اگلے دن دفن کیا گیا۔ آپ کے دفن کرنے پر بھی اختلاف تھا کہ کس جگہ آپ کی قبر مبارک ہو۔ اس مشکل کو بھی حضرت ابوبکر نے حل کیا اور فرمایا کہ نبی جہاں فوت ہوتا ہے وہیں دفن ہوتا ہے۔ اس لئے آپ کی قبر اسی حجرے میں بنائی گئی۔ اور اس کے بعد مسجد نبوی میں حضرت ابوبکر کی عام بیعت بحیثیت خلیفہ رسول اللہ صلعم ہوئی۔ بیعت کے بعد حضرت ابوبکر نے ایک تقریر کی جس میں

آپ نے فرمایا کہ میرے دل میں خلافت کی خواہش کبھی نہیں ہوئی نہ خلوت میں نہ جلوت میں۔ صرف فتنہ سے بچنے کے لئے میں نے اس منصب کو قبول کیا ہے۔ اور منصب امارت یا خلافت کا وہ اصول بتایا جس کو اگر مسلمان قایم رکھتے۔ تو ان کی وہ زبردست حکومت جو کل دنیا پر پھیل گئی تھی۔ کبھی بربادی کا یہ دن نہ دیکھتی۔ جو آج دیکھ رہی ہے آپ نے فرمایا ان احسنت فاعینونی وان اسأت فقوّمونی۔ اگر میں اچھا کام کروں تو تم میری مدد کرو اور اگر میں برا کام کروں تو تم مجھے درست کرو۔ گویا بتا دیا کہ حکومت اصل میں قوم کی ہے۔ اگر بادشاہ یا حکام قوم کو بھلائی کی راہ پر چلائیں تو اس میں ان کی اعانت کرنی چاہئے۔ لیکن اگر وہ اس کو نقصان کے رستہ کیطرف لیجانا چاہیں تو پھر قوم کا فرض ہوتا ہے کہ بادشاہ کو درست کرے۔ اسی خطبہ میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ تم میں سے کمزور میرے نزدیک قوی ہوگا۔ یہاں تک کہ میں اسے اس کا حق دلا دوں۔ اور تم میں سے قوی میرے نزدیک کمزور ہوگا۔ یہاں تک کہ جو حق اس کے ذمہ ہے اس سے لے لوں۔ اس میں یہ بتایا کہ حکومت کی اصل غرض یہ ہے کہ امن قایم رہے۔ اور لوگ ایک دوسرے کی حق تلفی نہ کریں۔ اور حکومت کا یہ فرض ہے کہ کمزوروں کی زبردستوں کے مقابلہ میں مدد کرے۔ اور پھر قوم کو اس کی زندگی کا راز بھی اس خطبہ میں بتایا۔ فرمایا کہ اگر تم کوشش کرنا چھوڑ دوگے اور آرام و آسایش طلب کروگے تو تم پر ذلت وارد ہوگی[1] اور آخر پر فرمایا اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فاذا عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم۔ میری فرمانبرداری اس وقت تک کرو جب تک کہ میں اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کروں۔ جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو پھر میری اطاعت تم پر واجب نہیں۔ اس خطبہ کا ایک ایک لفظ اس قابل ہے کہ مسلمان آج اپنے لئے مشعل راہ بنائیں نظام قوم چاہتا ہے کہ ایک سردار ہو مگر اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے خلاف کسی کی بات نہ مانی جائے۔ خواہ وہ بادشاہ وقت ہو یا امام مجتہد۔ آج مسلمانوں کو اپنا نظام

[1] لایدع قوم الجہاد فی سبیل اللہ الا ضربہم اللہ بالذل۔ جہاد سے مراد لازماً جہاد بالسیف نہیں بلکہ ہر قسم کی کوشش مراد ہے۔ ہاں جب دشمن تلوار لیکر اُٹھے تو تلوار سے ہی مقابلہ چاہیئے۔

اسی اصول پر قایم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

حضرت ابوبکر کی عمر آپ کی خلافت کے وقت ۶۱ سال تھی گویا رسول اللہ صلعم سے آپ دو سال چھوٹے تھے۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ آپ عمر میں رسول اللہ صلعم سے بڑے تھے۔ آپ کا اصل نام عبد اللہ تھا۔ ابوبکر آپ کی کنیت تھی اور صدیق آپ کا لقب تھا۔ عتیق بھی آپ کو کہا جاتا تھا۔ آپ قریش کے رؤساءمیں سے تھے۔ قریش نے ملک داری کے فرائض اپنے مختلف خاندانوں میں تقسیم کر رکھے تھے۔ ان میں سے خونبہا کا فیصلہ کرنا آپ کے سپرد کیا تھا۔ آپ جاہلیت میں ہی اپنی صداقت، راستبازی، غربا و مساکین کی خبرگیری اخلاق فاضلہ کی وجہ سے مشہور تھے۔ باوجود عرب کی کثرت مے نوشی کے آپ نے جاہلیت میں بھی کبھی شراب نہیں پی۔ مردوں میں سے آپ سب سے پہلے آنحضرت صلعم پر ایمان لائے۔ تبلیغ کا آپ میں اس قدر جوش تھا کہ بڑے بڑے رؤسائے قریش کو دعوت دی۔ حضرت عثمان۔ زبیر۔ سعد بن ابی وقاص۔ طلحہ۔ عبد الرحمٰن بن عوف آپ کی تبلیغ سے داخل اسلام ہوئے۔ اس کے علاوہ بہت سے غلام جن کو ان کے مالک اسلام لانے پر دکھ دیتے تھے آپ نے خود خرید کر آزاد کر دیئے۔ انہیں میں سے حضرت بلال تھے۔ چالیس ہزار درہم کے قریب آپ نے اس طرح اللہ کی راہ میں خرچ کئے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جو فائدہ مجھ کو ابوبکر کے مال سے ہؤا اور کسی کے مال سے نہیں ہؤا۔ اور ایک حدیث میں ہے مال اور مصاحبت کے بارے میں سب سے بڑھ کر احسان مجھ پر ابوبکر کا ہے۔ مدینہ کی ہجرت کے وقت آنحضرت صلعم نے سب صحابہ کو ایک ایک کر کے پہلے مدینہ بھیج دیا۔ مگر ابوبکر کو اپنی رفاقت کے لئے رکھا[1]۔ جنگ بدر میں جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مشغول دعا تھے حضرت ابوبکر آپ کے عریش کے دروازہ پر پہرہ دے رہے تھے۔ اُحد میں جب بہت سے صحابہ متفرق ہو گئے آپ آنحضرت صلعم کے ساتھ

حضرت ابوبکر کی فضیلت صحابہ پر

---

[1] الا تنصروہ فقد نصرہ اللہ اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذ ھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا (التوبۃ - ۹) ثانی اثنین میں بتایا ہے کہ آپ کو رسول اللہ صلعم سے وہ خاص مرتبہ حاصل ہے جو دوسرے کسی صحابی کو حاصل نہیں ہؤا۔

تھے۔ صلح حدیبیہ میں جب صلح کی شرائط کی وجہ سے اکثر دلوں میں گھبراہٹ تھی۔ آپ نے حضرت عمرؓ کو وہی جواب دیا جو خود آنحضرت صلعم نے دیا تھا۔ سنہ ۹ھ میں جب صحابہ حج کے لئے گئے تو آنحضرت صلعم نے اپنی غیر حاضری میں حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج مقرر کر کے بھیجا۔ اور جب آنحضرت صلعم آخری بیماری میں نمازوں میں تشریف آوری سے معذور ہو گئے تو حضرت ابوبکرؓ کو اپنی جگہ امام مقرر کیا۔ غرض حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت جملہ صحابہ پر روز روشن کی طرح ظاہر تھی۔ اور اسی لئے جب خلیفہ کے انتخاب کی ضرورت پیش آئی تو تمام لوگوں کی طبائع کا رجحان خود بخود حضرت ابوبکرؓ کی طرف تھا۔

حضرت علیؓ کا بیعت کرنا

صرف حضرت علیؓ کے متعلق بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ نے چھ ماہ تک بیعت نہیں کی۔ مگر یہ روایات صحیح نہیں اور ان کے بالمقابل دوسری روایات موجود ہیں۔ کہ حضرت علیؓ نے اسی دن بیعت کی۔ ہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ پہلے عام مجمع میں موجود نہ تھے جس میں بیعت ہوئی اور ان دونوں کو حضرت ابوبکرؓ نے گھر سے بلوایا اور یہ کہا کہ آپ جماعت اسلام میں تفرقہ چاہتے ہیں تو انہوں نے عرض کیا کہ آپ ملامت نہ کریں اور بیعت کر لی۔ یہ ممکن ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے اس فیصلہ کی وجہ سے جو بعد میں حضرت رسالتمآب کی وراثت کے معاملہ میں آپؓ نے حضرت فاطمہؓ کے خلاف دیا۔ حضرت علیؓ بھی حضرت فاطمہؓ کی طرح کسی قدر کشیدہ خاطر ہو گئے ہوں۔ جس سے بیعت نہ کرنے کی روایات کو قوت مل گئی لیکن آنحضرت صلعم کی وفات کے چند روز بعد ہی جو حملہ مدینہ پر ہوا اس کے دفعیہ میں حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے حکم کے ماتحت حصہ لیا جیسا کہ آگے چل کر واقعات تاریخی سے معلوم ہوگا اور یہ وفات سے دو ماہ کے اندر اندر کا واقعہ ہے۔

اسلام میں بادشاہت کا اصول انتخاب ہے نہ وراثت

حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب نے ہمیشہ کے لئے اس بات کا فیصلہ کر دیا کہ اسلام میں بادشاہت وراثت سے نہیں انتخاب سے ہے۔ اور مسلمانوں نے اس اصول کو خلافت راشدہ کے زمانہ کے بعد ترک کر کے اور بادشاہت کو ورثہ بنا کر اپنے آپ کو اور اسلام کو سخت نقصان پہنچایا ہے[1] حضرت ابوبکرؓ

[1] قرآن کریم نے دوسرے پارے کے آخر طالوت کے ذکر میں بھی اشارہ کیا ہے۔

[1] ملاحظہ ہو حاشیہ۔

کے انتخاب کے متعلق جو بعض روایات میں الفاظ آتے ہیں کہ آپ کی بیعت ناگہانی تھی تو اس سے بھی یہ مطلب نہیں کہ آپ کی خلافت انتخاب سے نہ تھی جیسا کہ واقعات مندرجہ بالا سے ظاہر ہے۔ انتخاب تو ہوا لیکن انتخاب کا واقعہ ناگہانی طور پر پیش آیا۔ اور اس کی وجہ انصار کا علیحدہ مشورہ تھا۔ اگر انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع نہ ہوتے۔ اور وہاں خلیفہ کے انتخاب کا سوال نہ اٹھتا۔ تو کل مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر بھی وہی انتخاب کرتے جو سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوا۔ یعنی حضرت ابوبکر کا انتخاب ۔علم ۔زہد۔ اتقا۔ فہم قرآن۔ اخلاق میں آپ کی فضیلت اگر اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم نے انہیں اپنی جگہ مسلمانوں کا امام بنایا تو معاملہ فہمی۔ دور اندیشی۔ اور قوت جسمانی میں فوقیت اس سے ظاہر ہے کہ ہجرت میں حضرت ابوبکر کو اپنے ساتھ رکھا۔ بدر میں بھی آپ کو یہی ممتاز مرتبہ دیا۔ اور صحابہ کے نزدیک بھی یہ ہر دو امر مسلم تھے۔ جس کی وجہ سے آپ کا انتخاب ہوا۔ اور جب لوگوں کو یہ علم ہوا کہ حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے ہیں تو سب نے خوشی خوشی آپ کی بیعت کی۔ اگر ایک یا دو آدمی علیحدہ بھی رہ گئے ہوں پھر بھی انتخاب متفقہ ہوگا۔ حالانکہ اگر کثرت رائے سے بھی ہوتا تو ہرج نہ تھا۔

ابوبکر کے انتخاب میں خدا کا ہاتھ

ہاں انتخاب غلط بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ان واقعات نے جو انتخاب کے بعد ظہور پذیر ہوئے صاف بتا دیا کہ یہ بہترین انتخاب تھا۔ جو ہو سکتا تھا۔ اور فی الحقیقت اس کے اندر خدا کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ قرآن کریم میں جہاں مسلمانوں کو خلافت کا وعدہ دیا گیا ہے۔ وہاں یہ فرمایا ہے۔ ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا (النور ع ۷ - ۵۵) یعنی ان کے دین کو جو ان کے لئے پسند کیا ہے اللہ تعالیٰ تمکین عطا فرمائے گا۔ اور خوف کے بعد امن کی حالت

کہ بادشاہت انتخاب سے ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس انتخاب میں کن باتوں کا لحاظ رکھا جائے ان اللہ اصطفٰہ علیکم وزادہ بسطۃ فی العلم والجسم یعنی ایک طرف وسعت علمی اس عہدہ کے لئے بکار ہے تو دوسری طرف قوت جسمانی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بادشاہوں کو دشمنوں سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔

بدل دے گا۔ سو جیسا کہ آگے آنے والے تاریخی واقعات بتاتے ہیں۔ حضرت ابوبکر کی قوت ایمانی اور شجاعت سے دین اسلام کامل طور پر مضبوط ہو گیا۔ اور خطرناک خوف کے بعد جب اندیشہ تھا کہ اسلام کا نام ہمیشہ کے لئے دنیا سے مٹ جائیگا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے پھر حالت امن پیدا کر دی۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ کرنا کہ خلافت اسلامی کو قایم کر کے وہ دین اسلام کو تمکین عطا فرمائے گا۔ اور خوف کے بعد امن کی حالت پیدا کردیگا۔ دوسری طرف حضرت ابوبکر کے ہاتھ سے دین کی کامل تمکین ہونا۔ اور خطرناک خوف کی حالت پیدا ہو کر امن کا پیدا ہونا اس بات کی کھلی کھلی شہادت ہے کہ حضرت ابوبکر کی خلافت عین منشائے الٰہی کے مطابق تھی۔

سب سے پہلا کام جو حضرت ابوبکر نے زمام سلطنت کو ہاتھ میں لیکر کیا یہ تھا کہ حضرت

جیش اسامہ

اسامہ بن زید کے لشکر کو ملک شام کی طرف روانہ کیا۔ آپ کے اس فیصلہ نے بتا دیا کہ آپ کو کس قدر ایمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اور الٰہی نصرت پر تھا۔ اور آپ کے دل میں تمام دنیا کے مقابلے کے لئے کس قدر قوت تھی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شام کے عیسائیوں کی زیادتیوں کی وجہ سے آنحضرت صلعم نے اپنی آخری بیماری سے دو یوم پیشتر ایک لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ اور اسامہ بن زید کو جن کے والد زیدؓ شام کی پہلی مہم میں شہید ہو گئے تھے اس کا افسر مقرر کیا۔ اور حضرت ابوبکر و عمر و اجلہ صحابہ کو اُنکے ماتحت رکھا۔ یہ اپنی آخری زندگی میں پھر اسلامی مساوات کا سبق دیا۔ اور بتایا کہ اسلام غلاموں تک کو بھی بلند سے بلند مرتبہ پر پہنچانا چاہتا ہے۔ اسامہ کے والد زید آزاد کردہ غلام تھے۔ اور بڑے بڑے قریش سردار محض ایک مساوات کا سبق سکھانے کے لئے ان کے ماتحت رکھے گئے۔ آنحضرت صلعم کی بیماری میں ہی لشکر تیار ہؤا۔ اور مدینہ کے باہر پڑاؤ ڈال دیا۔ مگر چونکہ رسول اللہ صلعم کی بیماری زور پکڑتی گئی۔ اس لئے اسامہ نے روانگی کو ملتوی کر دیا جب آنحضرت صلعم کا انتقال ہو گیا اور حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو سب سے پہلے آپ نے لشکر کی روانگی کا حکم دیا۔ لیکن اسی اثنا میں ایک طرف تو کچھ جھوٹے مدعیان نبوت کھڑے ہو چکے تھے یعنی رسول اللہ صلعم کی زندگی کے آخری ایام میں مسیلمہ کذاب نے

بنی حنیفہ میں۔ اور اسود عنسی نے یمن میں۔ طلیحہ نے بنی اسد میں نبوت کے دعوے کئے تھے۔ اور بہت سی خلق خدا کو گمراہ کر کے ملک میں فساد پیدا کر دیا تھا۔ دوسری طرف کچھ اُن کے اثر سے کچھ رسول اللہ صلعم کی وفات کی خبر سے بعض قبائل عرب میں شورش اور بغاوت پیدا ہو گئی۔ اور ان شورشوں کی افواہوں سے سارے ملک میں بدامنی کی صورت پیدا ہو گئی یہاں تک کہ خود مدینہ پر حملہ کا سخت خطرہ تھا۔ ان حالات میں صحابہ نے حضرت ابوبکر سے درخواست کی کہ اسامہ کے لشکر کی روانگی کا حکم منسوخ کر دیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ فوج کے نکل جانے سے دشمنان اسلام اور بھی دلیر ہو جائیں اور خلافت کا ہی خاتمہ کر دیں۔ مگر حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ میں اس لشکر کو کس طرح روک سکتا ہوں۔ جسے خود رسول اللہ صلعم نے تیار کیا۔ اور فرمایا خواہ کچھ بھی ہو جائے اور خواہ مدینہ پر اور خود مجھ پر بڑی سے بڑی مصیبت آجائے مگر رسول اللہ صلعم کا ارشاد پورا ہو کر رہے گا۔ حضرت عمر کی وساطت سے لوگوں نے یہ بھی عرض کیا کہ اسامہ نوجوان ہیں۔ فوج کی افسری کسی زیادہ تجربہ کار آدمی کے ہاتھ میں دی جائے۔ مگر آپ نے حضرت عمر کو سختی سے ڈانٹا اور فرمایا کہ رسول خدا ایک شخص کو امیر لشکر مقرر کریں اور میں اسے معزول کر کے اس کی جگہ دوسرے کو مقرر کروں۔ آخر یہ لشکر روانہ ہوا۔ حضرت ابوبکر خود پیدل ساتھ تھے۔ اور اسامہ گھوڑے پر سوار تھے۔ انہوں نے بہتیرا چاہا کہ یا آپ سوار ہو جائیں یا وہ بھی پیدل ہو جائیں۔ مگر آپ نے منظور نہ کیا۔ اور آخر سارے لشکر کو جس میں بڑے بڑے صحابہ تھے رخصت کر کے اور حضرت عمر کی واپسی کی اجازت اسامہ سے لیکر واپس آئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول خدا صلعم کی محبت اور طاعت آپ کے دل میں کس قدر تھی۔

اب مدینہ اسلامی فوج سے خالی تھا۔ اور عرب کی حالت تشویشناک ہو چکی تھی اور اس کی سب سے بڑی وجہ چند جھوٹے مدعیان نبوت کا پیدا ہو جانا تھا

جھوٹے مدعیان نبوت

آنحضرت صلعم سے پہلے ملک عرب میں کوئی اس قسم کا دعویدار نظر نہیں آتا۔ مگر جب رسول اللہ صلعم کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی اور قریباً سارا ملک عرب آپ پر ایمان لے آیا بلکہ آپ کا مطیع بھی ہو گیا۔ تو کئی جھوٹے مدعیان نبوت ملک کی مختلف اطراف سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ اسلام پر ایک نیا حملہ تھا

اور ایسا خطرناک حملہ تھا۔ کہ اگر یہ پودا خدا کے ہاتھ کا لگایا ہوا نہ ہوتا تو اس طوفانِ بے تمیزی میں یقیناً برباد ہو جاتا۔ مگر اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ یہ نظارہ بھی دنیا کو دکھا دے کہ جھوٹا مدعیٔ نبوت کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور سچے کی کامیابی کسی قسم کی مخالفت سے رک نہیں سکتی۔ وہی ملک عرب تھا وہی اس کے لوگ تھے۔ ہر ایک کاذب مدعی کے ساتھ اس کی قوم میں سے ایک عظیم الشان فوج بھی ہو گئی۔ مگر ایک نہیں چار یا پانچ مدعیان نبوت ایک ہی وقت میں اسلام کی ایسی بے کسی کے وقت بھی ناکامی اور نامرادی کا منہ دیکھتے ہیں۔ اس کے بالمقابل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب دعویٰ کیا تو اپنی قوم نے بھی آنحضرت صلعم کو چھوڑ دیا۔ بلکہ سخت ترین دشمن بن گئی، طرح طرح سے اذیتیں پہنچائیں، گھر سے نکالا، قتل کے منصوبے کئے، لڑائی کر کے آپ کو نیست و نابود کرنا چاہا۔ اور سارا ملک عرب الگ آپ کا دشمن تھا۔ لیکن اس بیکس اور اکیلے انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر عظیم الشان کامیابی عطا فرمائی کہ آخر کار سارے ملک عرب کا بادشاہ بھی بنا دیا۔ جھوٹے مدعی اٹھتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں جنگجو لوگ اُن کے ساتھ ہو جاتے ہیں ایک مسیلمہ کے ساتھ ساٹھ ہزار فوج تھی۔ مگر جتنے اٹھتے ہیں سب کے سب ناکام و نامراد ہوتے ہیں۔ اگر عرب کے لوگ تلوار سے کسی مذہب کے پیرو ہو سکتے تھے تو یقیناً ان جھوٹے مدعیانِ نبوت کو کامیاب ہونا چاہئے تھا۔ مگر ان صاحبان جمعیت اور افواج کو ہلاک اور نامراد کر کے اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ وہ خدا کی نصرت تھی جس نے ایک اکیلے انسان کو جس کا نہ صرف سارا ملک دشمن تھا بلکہ اپنی قوم بھی خطرناک دشمن بن گئی تھی وہ عظیم الشان کامیابی عطا فرمائی جس کی نظیر دنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

اسود عنسی

ان جھوٹے مدعیانِ نبوت میں سے سب سے پہلے اسود عنسی ہے۔ اس نے یمن کے ایک قبیلہ میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ یہ شخص اپنی قوم میں صاحب حیثیت اور سردار تھا۔ شعبدہ بازی سے آہستہ آہستہ لوگوں پر اثر ڈالنا شروع کیا۔ اور قرب و جوار کے سرداران قوم کو خفیہ طور پر اپنے ساتھ ملا کر جب کافی طاقت دیکھی تو علی الاعلان علم بغاوت بلند کیا۔ اور آنحضرت صلعم کے عاملوں کو نکلوا دیا۔ یہ دسویں سال ہجرت کے آخری ایام کا واقعہ ہے۔ نجران پر حملہ کر کے اسے بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور آخر صنعا دار الخلافہ یمن پر حملہ کر کے قابض ہو گیا۔ اور وہاں کے حاکم

شہر بن باذان کو قتل کر کے اس کی بیوہ سے شادی کر لی۔ اور یمن اور جنوب عرب کے سارے علاقہ پر تسلط ہو گیا۔ اس کے دعویٰ اور بغاوت کی خبر آنحضرت صلعم کو پہنچی تو آپ نے معاذ بن جبل کو اور دیگر عمال کو اس فساد کے انسداد اور اس کے قتل کا حکم بھیجا۔ آخر مقتول حاکم یمن شہر بن باذان کے ایک قریبی رشتہ دار فیروز دیلمی نے رات کے وقت اس کے محل میں داخل ہو کر اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ واقعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ایک دو روز پیشتر ہوا۔ اور اس کی خبر مدینہ میں حضرت ابوبکر کی خلافت میں پہنچی لیکن دوسری طرف جب یمن میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر پہنچی۔ تو باوجود اسود کے قتل ہو جانے کے کچھ شوریدہ سروں نے امن کی حالت وہاں قائم نہ ہونے دی۔ اور جس بغاوت کی بنیاد اسود نے رکھی تھی وہ قائم رہی۔

مسیلمہ کذاب دوسرا مدعیٔ نبوت قوم بنی حنیفہ سے تھا اور وہ مسیلمہ کذاب کے نام سے مشہور ہے جب اس قوم کا وفد نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو مسیلمہ بھی ساتھ تھا۔ واپس جا کر اس نے معمولی شعبدہ بازیوں سے لوگوں پر اثر ڈالنا شروع کیا۔ اور چند نہایت بیہودہ فقرے گھڑ کر نبوت کا دعویٰ کیا۔ اور آنحضرت صلعم کی خدمت میں ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ مجھے بھی آپ کے ساتھ امر نبوت میں شریک کیا گیا ہے۔ اور نصف ملک ہمارے لئے ہے۔ اور نصف ملک قریش کے لئے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جواب میں لکھوایا کہ ملک تو سب اللہ کے لئے ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور عاقبت متقیوں کے لئے ہے[1] اور ایک شخص کو مسیلمہ کو سمجھانے کے لئے بھیجا کہ وہ اس کذب و افترا سے باز آ جائے۔ مگر اس نے یمامہ میں علم بغاوت کھڑا کیا۔ اور آخر حضرت ابوبکر کے ابتداء زمانہ خلافت میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔ اسود اور مسیلمہ کے متعلق آنحضرت صلعم نے اپنا ایک رویا بھی بیان کیا تھا کہ میں نے اپنے ہاتھوں میں دو کنگن دیکھے ہیں جنہیں میں نے پھونک مار کر اڑا دیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ دو کذاب ہیں۔ چنانچہ جھوٹے مدعیان نبوت میں سے

[1] بسم اللہ الرحمن الرحیم من محمد رسول اللہ الی مسیلمۃ الکذاب السلام علی من اتبع الھدیٰ اما بعد فان الارض للہ یورثھا من یشاء والعاقبۃ للمتقین۔

یہی دو شخص قتل ہوئے اور باقی دو جن کا ذکر آگے آتا ہے یعنی طلیحہ اور سجاح آخر کار مسلمان ہوئے۔

طلیحہ اسدی

تیسرا مدعی نبوت طلیحہ تھا جو قوم بنی اسد کا سردار تھا۔ اور نجد کے علاقہ کا ایک مشہور جنگی آدمی تھا۔ اس کی قوم ایک دفعہ بیابان میں سے گذر رہی تھی۔ اور پانی نہ ملتا تھا۔ طلیحہ نے ایک جگہ کا پتہ بتایا جہاں سے پانی مل گیا۔ اسی کو اپنا معجزہ بنا کر اس نے دعوئے نبوت کیا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اس نے بھی علم بغاوت بلند کیا اور حضرت خالد کی فوج سے جنگ کر کے شکست کھائی اور ملک شام کی طرف بھاگ گیا۔ جب اس کی قوم بنی اسد کو معاف کر دیا گیا تو طلیحہ بھی آگیا اور مسلمان ہوا۔ حضرت عمر کے زمانے میں عراق میں مسلمانوں کی طرف سے لڑتا رہا اور اپنی بہادری اور کارناموں سے بڑی ناموری حاصل کی۔

سجاح

چوتھی مدعیہ نبوت ایک عورت سجاح نام تھی۔ یہ عورت اصل میں وسط عرب کے ایک قبیلہ بنی یربوع سے تھی۔ مگر اس کے خاندان کے لوگ عراق عرب میں بنی تغلب سے جا ملے تھے۔ اور اس قوم میں اس نے عیسائیت میں پرورش پائی تھی۔ اس عورت نے جب یہ سنا کہ ملک عرب میں شورش ہے تو وہ بھی تغلب اور دیگر عیسائی اقوام کو لے کر نکلی کہ مدینہ پر حملہ آور ہو (یہ بات خصوصیت سے یاد رکھنے کے قابل ہے کیونکہ سرحد ایران کی پہلی مہم میں آخری مقام جو حضرت خالد نے فتح کیا وہ اسی قوم بنی تغلب کا مرکز تھا یعنی عین التمر) بنی تمیم میں پہنچ کر اس نے اپنے قبیلہ بنی یربوع کے لوگوں کو بلایا اور اس نے کہا کہ اگر وہ اس کا ساتھ دیں تو بصورت فتح وہ ملک عرب کی بادشاہت میں حصہ دار ہوں گے۔ چنانچہ یہ قبیلہ مالک بن نویرہ کی سرکردگی میں اس سے مل گیا۔ مگر قوم تمیم کے باقی قبیلوں نے اس کی بات کو قبول نہ کیا۔ اس نے تلوار کے زور سے انہیں مسخر کرنا چاہا۔ مگر ناکام ہو کر پہلے مسیلمہ پر حملہ آور ہونے کے ارادہ سے یمامہ کی طرف بڑھی۔ مسیلمہ نے اسے تحائف اور دوستانہ پیغام بھیج کر مصالحت چاہی۔ وہ اس کے خیمہ میں آنے پر راضی ہو گئی۔ ملاقات پر ایک نے دوسرے کی نبوت کی تصدیق کی اور تین دن تک مسیلمہ کے پاس رہ کر آخر مسلمانوں کے لشکر کے خوف

کی وجہ سے اپنی قوم بنی تغلب میں واپس آ گئی۔ اور حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ میں مسلمان ہو گئی۔

غرض خلافت کے ساتھ ہی ایک عظیم الشان فتنہ جس کا مقابلہ حضرت ابوبکر کو کرنا پڑا۔

بعض قبائل کے ارتداد کی وجہ

جھوٹے مدعیانِ نبوت کا فتنہ تھا جنہوں نے جنوب۔ شمال۔ وسط۔ مشرق میں ایک آگ لگا دی۔ جو لوگ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ عرصہ پیشتر اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ اور جنہیں تعلیم اسلامی دینے کا کافی وقت آپکو مل چکا تھا وہ تو اسلام پر ایسے پختہ تھے کہ سخت سے سخت مصائب ان کے قدم کو جنبش میں نہ لا سکتی تھیں۔ یہاں تک کہ آپ کی وفات سے دو سال پیشتر کے لوگ بھی تعلیم اسلام کو اچھی طرح سمجھکر اس پر پختہ ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ میں کوئی فساد نہیں ہوا نہ کسی قسم کا ارتداد وقوع میں آیا لیکن بہت سے ایسے لوگ تھے۔ جو ابھی ابھی اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ اور غالباً بعض قوموں میں ابھی کہیں کہیں مشرک بھی تھے پھر بادیہ نشین ویسے بھی کسی قسم کی تعلیم سے بے بہرہ اور اجڈھ لوگ تھے۔ ان کا اسلام میں داخل ہونا ایک امر واقع ہے اور یہ بھی امر واقع ہے۔ کہ وہ بغیر کسی دباؤ کے خود بخود اسلام میں داخل ہوئے۔ لیکن اسلام میں داخل ہونا اور تعلیم اسلام میں پختہ ہونا دو علیحدہ علیحدہ باتیں ہیں ایک بچہ جو ایک مدرسہ میں داخل ہوتا ہے وہ پہلے دن سے تعلیم میں پختہ نہیں ہو جاتا۔ بلا شبہ وہ انقلاب جو آنحضرت صلعم نے ملک عرب کے اندر پیدا کر کے دکھایا کہ آپ کے سامنے سارا عرب سوائے چند یہود اور نصارےٰ کے شرک کو ترک کر کے اسلام میں داخل ہو گیا۔ تاریخ عالم میں ایک بے نظیر انقلاب ہے۔ جس کی مثال نہ اس سے پہلے کسی مصلح کی زندگی میں ملتی ہے نہ بعد میں۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں اسلام سے پہلے علم کا نام و نشان نہ تھا قبائل اور قومیں ایک دوسرے سے آزاد اور علیحدہ پڑی ہوئی تھیں۔ اور باہم تعلقات کے قائم ہونے کے ذرائع حد درجہ کے محدود تھے۔ دو چار ماہ میں سب لوگوں کو تعلیم اسلام پر مضبوط نہ کیا جا سکتا تھا۔ ان میں سے جو لوگ وفود میں شامل ہو کر مدینہ میں آتے تھے وہ عموماً صداقت اسلامی کا گہرا اثر ساتھ لے جاتے تھے۔ لیکن کثرت سے ایسے لوگ بھی تھے

جن کو یہ موقعہ نہ ملتا تھا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جہاں تک طاقت انسانی میں ہے ایسے لوگوں کی تعلیم کا انتظام بھی فرماتے تھے۔ اور ایسے لوگوں کو جنہوں نے آپ کی صحبت میں تعلیم پائی تھی ایک ایک دو دو کرکے باہر بھیج دیتے تھے۔ لیکن ادھر ہر قوم پر قوم قبیلہ پر قبیلہ کا وفد چلا آتا تھا اور مدینہ میں اس کثرت سے آدمی موجود نہ تھے کہ ہر ایک قبیلہ اور خاندان کے لئے کافی تعداد میں معلم بہم پہنچائے جاسکیں۔ دوسری طرف سب صحابہ کو مدینہ سے منتشر کردینا بھی دوراندیشی میں داخل نہ تھا اسی وجہ پر قرآن کریم میں ہدایت الٰہی بھی آچکی تھی کہ ان قوموں کی تعلیم کے لئے سب مومنوں کا مدینہ سے باہر نکل جانا مناسب نہیں۔ بلکہ تعلیم کا صحیح انتظام یہ ہے کہ ان قوموں میں سے تھوڑے تھوڑے لوگ آکر اور مدینہ میں رہ کر تعلیم حاصل کریں۔ اور پھر واپس جاکر اپنی قوم کو تعلیم دیں[۱] اور یہ انتظام اپنی تکمیل کے لئے کچھ وقت چاہتا تھا۔ اس لئے جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو گو لوگ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ لیکن بہت سے بادیہ نشین اور دور دور کے لوگ تعلیم اسلامی پر ابھی پختہ نہ ہوئے تھے۔

ارتداد محل اعتراض نہیں۔

تنگ دل معترض اعتراض پر اعتراض کرتے چلے جاتے ہیں اور حقیقت حال پر غور نہیں کرتے۔ جب اس کامیابی کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ تیئیس سال کے عرصہ میں ایک شخص سخت عداوت اور سارے ملک کی مخالفت کے باوجود ایک اتنے عظیم الشان ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک خطرناک بت پرستی اور شرک کو دور کرکے توحید کی آواز پھیلا دیتا ہے۔ اور جو ملک توحید کے نام سے بھی ناآشنا تھا اور مذہب کی حقیقت سے بیگانہ پڑا تھا۔ اس کے دشت وصحرا میں اس کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور اس کی غاروں میں اُسکے ریگستانوں اور بیابانوں کی پھیلی ہوئی آبادیوں میں اللہ اکبر کی آواز گونج اٹھتی ہے تو کھسیانے ہوکر کہتے ہیں کہ لوگ آنحضرت صلعم کے بعد مرتد ہو گئے۔ مگر اس قدر غور نہیں کرتے کہ کون لوگ؟ وہی جو ابھی حدیث العہد بالاسلام تھے۔ جنہوں نے اسلام تو

[۱] وما كان المؤمنون لينفروا كافة فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم (التوبة ۔ ۱۲۲)

قبول کر لیا تھا۔ مگر ابھی ان کی تعلیم کا پورا انتظام نہ ہوا تھا۔ کیونکہ اتنے بڑے ملک میں سب لوگوں کو تعلیم اسلام پر پختہ کرنے کے لئے ایک عرصہ چاہئے تھا۔ آج اگر اتنے بڑے ملک میں کوئی نیا مذہب پھیلایا جائے تو کیا کسی انسان کی طاقت میں ہے کہ چند ماہ میں اس مذہب کی پوری تعلیم سے بھی سب لوگوں کو واقف کر دے۔ اگر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے تو وہ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سارے عرب میں تعلیم اسلام کا پورا انتظام کرنے سے پیشتر ہو گئی۔ لیکن آنحضرت صلعم کا کام تکمیل دین تھا۔ اور اس دین کی نشر و اشاعت جس کا سلسلہ قیامت تک ممتد ہے۔ اس کے پیرووں کا کام ہے پس جب تکمیل دین ہو گئی اور دوسری طرف ملک عرب میں اسلام بھی پھیل گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اٹھا کر تعلیم دین کا باقی کام آپکے ساتھیوں سے لے لیا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک ہاتھ نبی کریم صلعم کی زندگی میں ظاہر ہوا کہ کس طرح بے کسی کی حالت سے نکل کر اسلام سارے ملک میں پھیل گیا۔ تو اس کی قدرت کا دوسرا ہاتھ آپ کی وفات پر ظاہر ہوا۔ کہ کس طرح اسلام پھر چاروں طرف سے مصائب میں گھر کر از سر نو زندہ ہوا۔

ایک اور امر یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ گو بعض قبائل میں ارتداد بھی ہوا۔

مانعین زکوٰۃ اور خاموش لوگ

لیکن یہ بات تاریخی طور پر صحیح نہیں کہ سارا عرب مرتد ہو گیا تھا۔ بہت سے لوگ ایسے تھے کہ جھوٹے مدعیانِ نبوت کے عارضی غلبہ کی وجہ سے ان کا تعلق مدینہ سے کٹ گیا تھا۔ مگر وہ نہ مرتد ہوئے نہ باغیوں کے ساتھ ملے بہت سے اُن کے دباؤ کی وجہ سے خاموش ہو گئے۔ بہت سے ایسے تھے جن کا خیال صرف یہ تھا کہ ان سے زکوٰۃ وصول نہیں ہونی چاہئے۔ عرب کی قومیں ہمیشہ ہر قسم کی حکومت سے آزاد رہی تھیں۔ اور اسلام نے جس نظام میں ان کو وابستہ کیا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ سب ایک مرکزی حکومت کے ماتحت ہوں۔ اور ایک بیت المال میں ان کی زکوٰۃ جمع ہو کر ضروریات قومی پر خرچ ہو مگر بعض قومیں پوری تعلیم اسلامی کی ناواقفیت کی وجہ سے اس ضرورت نظام کو نہ سمجھتی تھیں۔ اور آزادی کی عادات طبیعت میں سقدر راسخ تھیں کہ دوسرے کی حکومت کا جوا اٹھانا مشکل تھا۔ انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا۔ دوسری طرف حضرت ابوبکرؓ نظام وحدت کو سب سے زیادہ ضروری

امر خیال کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا اور بالکل صحیح تھا کہ اگر ملک میں وحدت اور نظام باقی نہ رہا تو اسلام بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ آپ نے ایسے لوگوں کے جواب میں فرمایا کہ جو قومیں زکوۃ کے دینے میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈالیں گی ان کے ساتھ جنگ کی جائیگی۔ کیونکہ اگر ان کی بات کو تسلیم کرلیا جاتا تو نظام قومی برباد ہوکر اسلام کی اصل غرض ہی فوت ہوتی تھی اور یوں بھی زکوۃ حکومت اسلامی کے خراج کا بڑا حصہ تھا۔ اس لئے خراج کا ادا نہ کرنا عملاً حکومت اسلامی سے بغاوت تھی۔ پس کچھ لوگ تو تعلیم اسلام سے ناواقف ہونے کی وجہ سے جھوٹے مدعیانِ نبوت کے دہوکہ میں آگئے اور بہت سے ایسے بھی تھے جنہوں نے آزادی کے غلط خیال کی وجہ سے زکوۃ دینے سے انکار کیا۔ اور اس طرح وہ بھی باغیوں میں ہی شمار ہوئے۔ اور کچھ اُن کے مقابلہ کی طاقت نہ پاکر خاموش ہو رہے۔ اور کچھ قوموں کے تعلقات باغیوں کے زور کی وجہ سے مدینہ سے منقطع ہوگئے

مدینہ کی حالت اور مقابلہ کی تیاری سلہ ھ / ۶۳۲ء

ملک عرب کی یہ حالت تھی جب حضرت ابوبکرؓ نے زمام خلافت کو ہاتھ میں لے کر اور ان مشکلات میں کسی کی بھی پرواہ نہ کرکے اپنے بہترین آدمیوں کو نبی کریم صلعم کے حکم کی تعمیل میں اسامہ کے ماتحت شام کی سرحد کی طرف بھیج دیا۔ اور مدینہ کو اپنی محافظ فوج سے بالکل خالی کردیا۔ یہ آپ کی زبردست قوت ایمانی کا نتیجہ تھا۔ اور اس کا اثر حالت ملکی پر بھی اچھا پڑا۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے چنانچہ تھوڑے سے آدمی جو باقی رہ گئے تھے ان کے ساتھ آپ نے مدینہ کی حفاظت کا انتظام کیا۔ مدینہ کے قرب وجوار میں جس قدر آدمی مل سکتے تھے انہیں بھی بلا لیا گیا۔ اور جن جن رستوں سے شہر پر حملہ ہوسکتا تھا۔ وہاں چھوٹے چھوٹے دستے متعین کردیئے گئے طلیحہ جھوٹے مدعیٔ نبوت نے اپنے بھائی کو بھیج کر مدینہ کے شمال میں بیابان کی قوموں کو اکسایا۔ اور ان کا ایک ٹڈی دل جمع ہوگیا لیکن وہ اسلام سے منحرف نہ تھے اور نہ ہی طلیحہ کے ساتھ تھے۔ آخر انہوں نے اپنا ایک وفد حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں بھیجا کہ انہیں ادائیگی زکوۃ سے مستثنیٰ کردیا جائے۔ مدینہ والوں نے اس وفد کے آنے کو غنیمت سمجھا اور بہت سے صحابہ کی یہ رائے ہوئی کہ ان حالات میں اس مطالبہ کو تسلیم کرلیا جائے تاکہ شورش دب جائے

مگر حضرت ابوبکر کی نظر بہت وسیع تھی انہوں نے دیکھا کہ اگر ایک جگہ یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تو حکومت اسلامی کا اثر سارے جزیرہ نما سے مٹ جائیگا اور وحدت اسلامی پاش پاش ہو جائیگی اور پھر قرآن کا صریح حکم تھا کہ زکوٰۃ ادا کی جائے اور ایک بیت المال میں جمع ہونے کے سوائے اس کی ادائیگی کی صورت نہ رہ سکتی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر زکوٰۃ میں سے ایک اونٹ باندھنے کی رسی بھی ادا نہ کریں گے تو میں اُن سے جنگ کروں گا۔ اس جواب نے مدینہ کی حالت کو اور بھی زیادہ مخدوش کر دیا۔ اور آپ نے سب مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا کہ وہ ہر وقت ہشیار رہیں۔ کیونکہ معلوم نہیں کس وقت یہ لوگ حملہ کر دیں۔ اور حضرت علی۔ زبیر اور طلحہ کو محافظ دستوں پر افسر مقرر کیا۔

تین دن بعد یہ لوگ ذوالقصہ سے جہاں ان کا اجتماع تھا آگے بڑھے اور مدینہ پر

مدینہ پر حملہ اور باغیوں کی شکست

حملہ آور ہوئے اس کی اطلاع بیرونی محافظ دستوں کے ذریعہ سے فوراً مدینہ میں پہنچ گئی اور آن کی آن میں مسلمان مقابلہ کے لئے آگے بڑھے بدویوں کو خیال بھی نہ تھا کہ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی فوج ہو گی اسلئے مقابلہ کی صورت دیکھتے ہی وہ پیچھے بھاگے۔ مسلمانوں نے تھوڑی دور تک ان کا تعاقب کیا۔ اور واپس ہو گئے۔ حضرت ابوبکر نے راتوں رات فوج کو جمع کیا اور صبح اندھیرے میں ہی پھر باغیوں پر بڑھے۔ تاب مقابلہ نہ پاکر یہ لوگ بھاگ اُٹھے۔ آپ نے ذوالقصہ۔ پر فوج کا ایک دستہ چھوڑا اور خود واپس آگئے۔ اس چھوٹی سی مہم کا یہ اثر ہوا کہ مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے اور بادیہ نشینوں نے سمجھ لیا کہ مدینہ میں حکومت کی طاقت اس قدر ہے کہ وہ فوج کے باہر ہوتے ہوئے بھی باغیوں کی سرکوبی کر سکتی ہے۔ باغیوں کی اس سرکوبی سے کئی جگہ سے زکوٰۃ کا مال آنا شروع ہو گیا۔ اور باغیوں اور جھوٹے مدعیان نبوت کے حوصلے پست ہونے شروع ہوئے یہ صرف حضرت ابوبکر کا پہاڑ کی طرح مضبوط ایمان تھا۔ جس نے اسلام کی کشتی کو اس خطرناک طوفان میں بچا کر کنارے لگایا۔

جمادی الثانی ۱۱ھ ستمبر ۶۳۲ء

اتنے میں اسامہ بھی سرحد کی مہم سے واپس آگئے حضرت ابوبکر نے ان کو شہر کی حفاظت کے لئے چھوڑا اور خود تھوڑی سی فوج ساتھ لے کر زبذہ کی طرف بڑھے۔ جہاں باغیوں کا اب

اجتماع تھا۔ باغیوں نے شکست کھائی اور بھاگ کر طلیحہ کی فوج سے جا ملے۔

شعبان ۱۱ھ
اکتوبر ۶۳۲ء

اب حضرت ابوبکرؓ نے بغاوت کے قلع قمع کا پورا تہیہ کر لیا۔ اور ساری فوج کو گیارہ حصوں میں تقسیم کر کے مختلف اطراف وجوانب میں روانہ کیا۔ ان میں سے خالد بن ولید کو طلیحہ اور پھر مالک بن نویرہ کے مقابلہ کے لئے۔ عکرمہ بن ابی جہل کو مسیلمہ کذاب کے مقابلہ کے لئے۔ شرحبیل کو عکرمہ کی مدد کے لئے۔ مہاجر بن ابی امیہ کو یمن اور حضرموت پر لشکر کشی کے لئے۔ ایک لشکر کو شام کی سرحد کے لئے۔ دو کو عمان اور مہرہ کی بغاوت فرو کرنے کے لئے۔ ایک کو قبیلہ قضاعہ کی سرکوبی کے لئے اور ایک کو بنی سلیم اور ہوازن کے مقابلہ کے لئے مقرر کیا۔ اور خود مدینہ میں رہ کر ان تمام افواج کی نقل وحرکت کی نگرانی کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے ایک فرمان افسران فوج کے نام اور ایک اعراب کے نام لکھ دیا۔ ہر دو کا خلاصہ یہ تھا کہ افسران فوج میانہ روی اور نرمی اختیار کریں۔ جس قوم پر جائیں پہلے انہیں اسلام کی طرف دعوت دیں۔ جو شخص اس کو مان لے اور لڑائی سے رک جائے اس کی مدد کی جائے۔ اور جو انکار کریں۔ اُن سے لڑائی کی جائے۔ یہ بھی انہیں بتا دیا گیا کہ اذان کو اسلام کا نشان سمجھا جائے۔

اطراف عرب میں مہمات کا بھیجا جانا

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت ابوبکر کی یہ کل کارروائی صرف بغاوت کے فرو کرنے کیلئے تھی۔ ہر ایک حکومت کو حق پہنچتا ہے کہ وہ باغیوں کی سرکوبی کرے اور اُن کے سرغنوں کو سزائے موت دے اور ضرورت ہو تو ان سے جنگ کرے لیکن یہاں کئی اور وجوہات بھی تھیں۔ اول تو ان باغیوں نے مسلمانوں کو قتل کیا۔ جگہ جگہ خونریزی کی اور پر امن علاقوں میں فساد برپا کیا۔ دوسرے وہ خود مدینہ پر حملہ کر کے اسلامی حکومت کو بکلی تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے اور ان کے مقابلہ میں ذرا بھی نرمی اختیار کی جاتی۔ تو فساد اس سے بھی دو چند ہوتا۔ تیسرے کثرت سے وفادار بھی موجود تھے۔ مگر ان باغیوں کی وجہ سے ان کے تعلقات مدینہ سے منقطع ہو گئے تھے۔ حضرموت اور بحرین کے دور دراز علاقوں میں بھی اگر ایک حصہ باغی تھا تو دوسرا وفادار بھی تھا۔ ایک قوم میں اگر ایک قبیلہ نے بغاوت اختیار کی تو دوسرا قبیلہ ایسا بھی موجود تھا جو باغیوں کے ساتھ شامل نہ

مہمات کی غرض بغاوت کا فرو کرنا تھا

تھا۔ ان حالات میں حضرت ابوبکر کے یہ احکام کہ پہلے دریافت کرلیا جائے کہ وہ لوگ مسلمان ہیں یا نہیں یا انہیں اسلام کی طرف دعوت دی جائے۔ مذہب اسلام کو بجبر منوانے کے قائمقام نہیں۔ غرض صرف یہ تھی کہ باغی دوسرے لوگوں سے بالکل الگ ہو جائیں۔ اور ایسا نہ ہو کہ ایک قوم میں بغاوت دیکھ کر اس کے سب قبیلوں کو باغی سمجھ لیا جائے۔ ہاں اس خطرناک بغاوت کو فرو کرنے کے بغیر مسلمان قوم کا زندہ رہنا ناممکن تھا۔ اور اگر وہ بغاوت کو فرو نہ کرتے تو باغی دنوں میں اسلام کا نام جزیرہ نمائے عرب سے مٹا دیتے۔

خالد کا طلیحہ کو شکست دینا

سب سے پہلے ہم خالد کے لشکر کو لیتے ہیں۔ خالد ان جوانمرد سپاہیوں میں سے ایک تھے جن کی نظیر دنیا میں تلاش کرنے سے مشکل ملتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ دوراندیش جرنیل بھی تھے۔ یہ اپنے لشکر کو لیکر پہلے طلیحہ کی طرف بڑھے۔ طلیحہ کے ساتھ عیینہ مع اپنی قوم غطفان کے مل گیا تھا۔ بنی طے میں سے بھی بعض لوگ اُن سے مل گئے تھے۔ لیکن خالد کے سمجھانے سے بنی طے کی کل قوم اسلامی لشکر کے ساتھ مل گئی۔ خالد اور طلیحہ کا مقابلہ بزاخہ کے مقام پر ہوا۔ عیینہ قید ہو کر مدینہ آیا اور توبہ کی۔ طلیحہ شام کی طرف بھاگ گیا خالد نے کچھ مدت ٹھہر کر یہاں امن قائم کیا۔ بنی اسد کو معاف کر دیا گیا صرف ان لوگوں کو سزا دی گئی جنھوں نے خون کیا تھا۔ جو قبیلے طلیحہ کے فساد کی وجہ سے الگ پڑے ہوئے تھے۔ وہ بھی اب ساتھ ہو گئے۔

مالک بن نویرہ

خالد یہاں سے فارغ ہو کر بنی تمیم کی طرف بڑھے انہی میں سے قبیلہ بنی یربوع کا سردار مالک بن نویرہ سجاح مدعیہ نبوت کے ساتھ مل گیا تھا۔ بنی تمیم کے دیگر قبائل نے یکے بعد دیگرے خالد سے وفاداری کا اظہار کیا۔ مگر بنی یربوع نہیں آئے۔ خالد نے ان پر چڑھائی کی تو وہ اپنی جگہ کو چھوڑ کر بھاگ چکے ہوئے تھے۔ خالد نے بعض مسلمانوں کی رائے کے خلاف ان کا تعاقب کر کے اُن میں سے بعض کو قید کر لیا۔ انہی میں مالک بن نویرہ بھی تھا۔ خالد کے کسی حکم میں غلط فہمی کی وجہ سے رات کو چند قیدی مع مالک کے قتل کر دیئے گئے۔ حضرت ابوبکر کے پاس شکایت ہوئی اور آپ نے خالد کو طلب کیا مگر اصل حالات پر آگاہ ہونے کے بعد ان کو بری ٹھہرایا۔

یہاں سے فارغ ہو کر خالد نے حضرت ابو بکر کے حکم سے مسیلمہ کی طرف رخ کیا۔ مسیلمہ کے مقابلہ کے لئے عکرمہ اور شرجیل کو بھیجا گیا تھا لیکن اس کی جمعیت زبردست تھی اور عکرمہ نے حملہ کرنے میں جلدی کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عکرمہ کو شکست ہوئی۔ اور خالد کی فاتح فوج کو ادھر رخ کرنے کا حکم دیا گیا۔ مسیلمہ کے ساتھ ساٹھ ہزار فوج تھی۔ خالد کی فوج تعداد میں بہت کم تھی۔ مگر تعداد کی کمی کے نقص کو ایمان کی مضبوطی نے دور کر دیا تھا۔ یمامہ کی جنگ تاریخ اسلام میں مشہور ہے مسلمان کئی دفعہ پسپا ہوئے پھر نئے جوش سے حملہ آور ہوئے۔ اور آخر مسیلمہ کا لشکر بھاگ اٹھا۔ اور ایک باغ میں جس کے ارد گرد اونچی فصیل تھی پناہ لی۔ اس قلعہ کو براء بن مالک کی ہمت نے آن کی آن میں فتح کرا دیا۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا تم مجھے دیوار پر چڑھا دو اور باغ کے اندر کود کر سینکڑوں آدمیوں کے اندر سے راستہ کاٹتے ہوئے باغ کے دروازہ پر پہنچ گئے اور دروازہ کھول دیا۔ مسیلمہ کو وحشی نے (جو ایک حبشی غلام تھا) قتل کر دیا اور اس کی فوج بھاگ گئی۔ مسلمانوں میں سے سات سو آدمی شہید ہوئے جن میں ایک کثیر تعداد قرآن شریف کے حافظوں کی تھی۔ مسیلمہ کی فوج میں مقتولوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ تھی۔ بنی حنیفہ نے اطاعت قبول کر لی جب ان کا وفد مدینہ میں آیا تو حضرت ابو بکر نے اُن سے دریافت کیا کہ مسیلمہ کیا تعلیم دیتا تھا۔ انہوں نے اس کے چند فقرات سنائے تو آپ نے تعجب کیا کہ ان لچر باتوں کو تم لوگوں نے کس طرح مان لیا۔

خالد کا مسیلمہ کو شکست دینا

ادھر خالد کی افواج نے بغاوت کے سب سے مضبوط مرکز کو سر کیا ادھر دوسری اطراف میں بھی مسلمانوں کی افواج ہر جگہ کامیاب ہوتی چلی گئیں بحرین میں جب رسول کریم صلعم کی وفات کی خبر پہنچی تو اس کے تھوڑے عرصہ بعد منذر بن ساوی وہاں کا مسلمان حاکم بھی فوت ہو گیا۔ اور اہل بحرین میں سے ایک قوم بنی عبد القیس اسلام پر قائم رہی۔ مگر دوسری یعنی بنی بکر نے مرتد ہو کر بغاوت اختیار کی۔ دونوں میں جنگ ہوئی۔ بنی بکر نے کسریٰ شاہ ایران سے مدد طلب کی اور بنی عبد القیس نے مدینہ سے۔ یہاں سے علاء بن الحضرمی کو کچھ فوج کے ساتھ بھیجا گیا۔ بنی بکر اور ان کی معاون شاہ ایران

بحرین کی بغاوت کا فرو کرنا

کی افواج نے شکست کھائی اور ایک قلعہ میں پناہ گزین ہوئے۔ مگر افواج اسلام نے ان کا تعاقب کرکے بحرین کو بغاوت سے بکلی پاک کردیا۔

عمان اور مہرہ کی باغیوں سے صفائی

(ح) عمان اور مہرہ کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے حذیفہ کو مقرر کیا گیا۔ اور عکرمہ کو بھی مسیلمہ کی افواج سے زک اٹھانے کے بعد اسی مہم پر امداد کے لئے بھیجا گیا۔ عمان میں بھی ایک شخص لقیط بن مالک نے پیغمبری کا دعویٰ کر رکھا تھا۔ اور ایک بھاری فوج دارالخلافہ دبا میں جمع کر رکھی تھی۔ اسلامی لشکر غالب آیا اور حذیفہ کو عمان کی حکومت پر چھوڑ کر عکرمہ نے مہرہ کی طرف رخ کیا۔ اور وہاں بھی بغاوت کو فرو کرکے امن قائم کیا۔

یمن اور حضرموت کی بغاوت کا انجام

(ط) حضرموت اور کندہ سے زکوٰۃ کی وصولی کا کام زیاد بن لبید کے سپرد ہوا تھا۔ رسول اللہ صلعم کی وفات کی خبر پر وہاں اشعث بن قیس اپنی قوم کے ساتھ مرتد ہوگیا۔ اور حضرموت میں علم بغاوت بلند کیا۔ زیاد نے وفادار قبیلوں کی مدد سے لڑائی کی مگر آخر بھاگنا پڑا۔ مدینہ سے مہاجر کو حضرموت کی بغاوت فرو کرنے کے لئے زیاد کے ساتھ بھیجا گیا۔ مگر کوئی فیصلہ کن جنگ نہ ہوئی تو عکرمہ کو جو اس وقت تک عمان اور مہرہ کی بغاوت کو فرو کر چکے تھے۔ حضرموت میں لشکر اسلامی کی امداد کیلئے بھیجا گیا۔ اشعث محصور ہوگیا اور آخر گرفتار ہوا۔ اور مدینہ میں آکر مسلمان ہوا۔ یمن کا علاقہ بھی اس اثنا میں بغاوت سے پاک ہو چکا تھا۔

خلافت اسلامی کی ایران و روما سے آویزش

سنہ ۱۲ھ ۶۳۳ء اس طرح ایک سال کے اندر اندر حضرت ابوبکرؓ نے عرب کے اس تمام علاقہ کو جو رسول اللہ صلعم کی وفات کے وقت حکومت اسلامی کے نیچے آچکا تھا بغاوت سے پاک کرکے از سر نو اس میں حکومت اسلامی کو قایم کیا۔ اس کے بعد آپ نے ایران اور شام کی سرحد کو مضبوط کرنے کا انتظام کیا۔ اور یہیں سے لڑائیوں کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان حضرت عمرؓ کے زمانہ میں قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے مالک ہوگئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بحرین کی بغاوت میں بنی بکر کے باغیوں نے شاہ ایران سے مدد طلب کی اور اس نے اپنی افواج کو مسلمانوں

کے مقابلہ پر بھیجا۔ یہ شاہ فارس کا کھلا کھلا دشمنی کا فعل تھا۔ اور صاف طور پر مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے۔ کیونکہ ایران کے ساتھ جنگ کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ اور اس میں پہل ایران کی طرف سے ہوئی جس نے حکومت اسلام کے باغیوں کی امداد کے لئے اپنی افواج کو ملک عرب میں داخل کیا۔ اگر آج ہندوستان میں کوئی بغاوت ہو اور کوئی دوسری حکومت اپنی افواج کو باغیوں کی امداد کے لئے اس ملک کے اندر داخل کرے تو کیا حکومت ہند اس بغاوت کو فرو کرنے کے بعد اطمینان سے بیٹھ جائیگی۔ جب تک کہ اس دوسری حکومت کو اس کی زیادتی کی سزا نہ دے لے۔ اور کیا اس دوسری حکومت کا ایسا فعل حکومت ہند کے ساتھ اعلان جنگ نہ سمجھا جائیگا۔ علاوہ ازیں عراق عرب کی اطراف سے جہاں اس وقت حکومت ایران کا اثر تھا۔ سجاح مدعیہ نبوت بھی ایک فوج لے کر مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے نکل چکی تھی اور وسط عرب تک ہو کر بڑھتے ہوئے اسلامی لشکر کے خوف سے واپس ہو گئی تھی۔ اور وہ اس قدر جرات نہ کر سکتی تھی جب تک کہ حکومت ایران اس کی پشت پر نہ ہوتی ایک اتنی چھوٹی قوم کے لئے اس قدر ہمت کرنا کہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو جائے ناممکن تھا۔ بہر حال ایران کی سرحد سے اس کی زیر اثر قوموں میں سے ایک قوم کا عرب پر حملہ آور ہونا ایران کو ایک اور خطرناک زیادتی کا صاف مجرم ٹھیراتا ہے۔ ان حالات میں سرحد ایران اور عراق کے متعلق حکومت اسلامی سخت خطرہ میں تھی۔ اور اپنی حفاظت کے لئے اسے ضروری ہوا کہ سرحد کو مضبوط کرے اور ان باتوں کا قرار واقعی انسداد کرے چنانچہ پہلی مہمات سب کی سب فرات کے مغرب تک محدود رہیں۔ جو تمام عرب آبادیاں تھیں۔ حالانکہ اگر اس سے آگے گذر کر مسلمان عراق عرب[1] پر بھی حملہ کرتے اور حکومت عرب اس تمام علاقہ کو

[1] عراق عرب ملک عرب کا وہ حصہ ہے جو دریائے دجلہ اور فرات کے درمیان ہے۔ یہ سب عرب کا حصہ ہے عرب قومیں ہی ہمیشہ سے یہاں آباد چلی آتی ہیں۔ مگر ایران نے عرب کے اس حصہ پر قبضہ کر لیا ہوا تھا۔ بلکہ فرات کے مغرب کی طرف بھی اپنا اثر پھیلایا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ فرات کے مغرب کی طرف بھی بعض اقوام ایران کی باجگذار ہو گئی تھیں۔

6898

الجلیل بھی امر الہیم یا رحمان

واپس لینے کیلئے بھی جنگ کرتی تو وہ تمام اخلاقی اور قومی قوانین کی رو سے حق بجانب ہوتی لیکن یہاں تو ایران کی طرف سے عرب کے خلاف کھلا اعلان جنگ ہی نہیں ہو چکا تھا بلکہ ایک طرف سرحد ایران کے جنوبی حصہ کی طرف سے ایرانی افواج باعیان عرب کی امداد کے لئے ملک عرب پر حملہ آور ہو چکی تھیں اور دوسری طرف اس سرحد کے شمال کی طرف سے سجاح اپنی فوج کو لیکر ملک عرب پر حملہ آور ہو چکی تھی۔ اگر مسلمان اس وقت اپنی سرحد کی حفاظت کی فکر نہ کرتے اور ایران کی زیادتیوں کی سزا کیلئے ہمت نہ دکھاتے تو وہ اپنی قوم سے دشمنی کرنے والے ہوتے۔ جن مورخین نے حضرت ابو بکر پر یہ الزام دیا ہے کہ محض عرب کی قوموں کو جنگ میں مشغول رکھنے کے لئے ہمسایہ سلطنتوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کی گئی اور کہ اس کی غرض محض عربوں کو لوٹ مار سے خوش رکھنا تھا تاکہ وہ پھر بغاوت نہ کریں۔ انہوں نے واقعات تاریخی کی طرف سے آنکھیں بند کر کے ایسا کیا ہے۔ ان کی غرض اس سے صرف اسی خیال کو قوت دینا ہے کہ مذہب اسلام تلوار سے اور لوٹ مار کر کے پھیلایا گیا۔ اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کوئی واقعہ نہیں دکھا سکتے کہ کسی قوم پر آپ نے پہل کی ہو۔ یا کسی قوم یا کسی شخص کو کبھی یہ کہا ہو کہ اسلام قبول کرو ورنہ تلوار ہے۔ تو خلافت راشدہ کی لڑائیوں کو جو اسلام کی سخت ترین مصیبت کے وقت پیش آئیں۔ اور جن میں پہل صاف طور پر دوسری قوموں کی طرف سے ہوئی غلط طور پر اس الزام کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے۔

بغاوت عرب اور سرحد کا استحکام

ان واقعات پر جو اس وقت ملک عرب میں ظاہر ہو چکے تھے ایک ہی سرسری نظر اس الزام کے بطلان کے لئے کافی ہے۔ جو حضرت ابو بکر پر دیا گیا ہے۔ ابھی ایک خطرناک بغاوت جو قریب تھا کہ اسلام کا وجود ہی مٹا دیتی فرو ہوئی ہے۔ اور جو لوگ ایک دفعہ اس طرح چالاک لوگوں کے ہاتھ میں ہتھیار بن کر اسلام کے لئے خطرناک ثابت ہو چکے ہیں ان کو قابو میں رکھنا معمولی سے معمولی دور اندیشی کا پہلا تقاضا تھا۔ اور انہیں قابو میں رکھنے کے لئے حضرت ابو بکر کے پاس مشکل سے کافی فوج تھی۔ کیا آج اگر کسی مہذب قوم کے کسی علاقہ میں ایسی خطرناک بغاوت ہو جائے اور پھر اس بغاوت کو فرو کرنے پر بغاوت کے سرغنوں تک کو بھی معاف کر دیا جائے تو وہ علاقہ حکومت کی زبردست تو

کے اظہار کے بغیر اور کافی فوج کی موجودگی کے بغیر محفوظ کہلا سکتا ہے ؟ حضرت ابوبکر نے وہ کام نہ کیا تھا جو آج کل کی مہذب اقوام کرلیتی ہیں۔ اور پھر اس کو انتظام مملکت کے لئے عین انصاف اور رحم بتاتی ہیں۔ یعنی یہ کہ تمام بغاوت میں حصہ لینے والوں کو پکڑ کر جلا وطن کردیا جائے۔ یا جیل خانوں میں ڈال دیا جائے۔ خواہ اُن کے بچے بھوک سے بلبلا بلبلا کر مرجائیں۔ خواہ اُن کی بیکس عورتوں کے تن پر اوڑھنے کو کپڑا تک نہ ہو۔ اور سرغنوں بلکہ ذرا بھی نمایاں حصہ لینے والوں کے لئے تو سوائے پھانسی اور قتل کے کوئی سزا ہی نہیں۔ مقام غور ہے کہ حضرت ابوبکر کو یہ حالت پیش نہیں آئی۔ کہ ملک کے ایک حصہ میں بغاوت ہوگئی ہو۔ اور باقی سارا ملک امن کی حالت میں اور وفاداری پر قائم رہا ہو۔ بلکہ یہاں سارے کا سارا ملک باغی ہوگیا۔ اور مشکل سے اس کے سویں حصہ پر حکومت اسلام باقی رہ گئی پھر اس وسیع اور خطرناک بغاوت کے سرغنے بھی اگر لڑائی میں نہیں مارے گئے تو ان کو معاف کردیا گیا۔ یہ سچ ہے کہ حضرت ابوبکر کو یہ یقین تھا کہ عرب کے لوگ دل سے صداقت اسلامی کے قائل ہیں اور محض بعض چالاک لوگوں کے دہوکہ میں آکر انہوں نے بغاوت کی ہے مگر پھر بھی اتنے وسیع ملک میں آئندہ احتمالات کے روکنے کے لئے فوج کا انتظام ضروری تھا۔ مگر حضرت ابوبکر نے ان احتمالات کی اس قدر فکر نہ کی جس قدر فکر آپ کو سرحد کے مضبوط کرنے کی ہوئی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپکو سرحد ایران اور شام ہر دو کی طرف سے سخت خطرہ تھا۔ حضرت ابوبکر کی دور اندیشی کو مخالف مورخین تک نے بھی تسلیم کیا ہے۔ پس یہ محض آپ کی دور اندیشی تھی کہ بغاوت کے فرو ہوتے ہی سرحدوں کی مضبوطی کی طرف توجہ کی۔ اندرون عرب سے ایک حد تک خطرہ دور ہوچکا تھا۔ مگر ہر دو سرحدوں پر سخت خطرہ موجود تھا۔ اگر اس کا انسداد فوراً نہ کیا جاتا تو انہی اطراف سے ملک عرب کے اندر دوبارہ وہ آگ بھڑک اٹھتی جو بمشکل ابھی بجھائی گئی تھی۔ اور پھر اس کو بجھانا مسلمانوں کی طاقت سے باہر ہوتا۔

حضرت ابوبکر پر اقوام عرب کو لوٹ مار میں لگانے کا بے بنیاد الزام

عرب کی قوموں کو لوٹ مار میں لگانے کے خیال سے ایران اور رومن امپائر پر چڑھنہ کرنا محض ایک قصہ ہے۔ جو اس زمانہ کے بعض متعصب مورخین کے دماغوں نے ایجاد کیا ہے۔ ان قوموں پر

تو بھی یہ بھی اطمینان نہ تھا کہ وہ امن قائم رہنے دیں گی۔ یہ خیال کہاں آسکتا تھا کہ انہی کو اپنے وفادار سپاہی سمجھ کر دو عظیم الشان سلطنتوں کے مقابل پر کھڑا کیا جائے۔ اور تاریخ سے یہ امر ثابت ہے کہ واقعی ان لوگوں کو جو بغاوت میں شامل ہوئے تھے ایک مدت تک اسلامی فوج میں نہیں لیا گیا۔ خود میور نے اپنی تاریخ خلافت اسلامیہ میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اول اول جب حضرت ابوبکر کو ایران اور شام کی سرحد کی طرف بڑھنا پڑا تو آپ نے اُن لوگوں کا فوج میں لینا روک دیا تھا جنہوں نے بغاوت میں حصہ لیا بلکہ آپ کی وفات تک یہی حالت رہی۔ اسی مؤرخ نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ حضرت ابوبکر بستر مرگ پر تھے جب عراق سے مثنیٰ کا یہ پیغام آپ کو پہنچا کہ ایران کی طرف سے خطرہ بڑھ رہا ہے۔ اور مزید فوج کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ جن لوگوں نے بغاوت میں حصہ لیا تھا اب انہیں فوج میں بھرتی کر لینا چاہئے۔ ایک طرف اس بات کو تسلیم کرنا کہ ان اقوام کو جو باغی ہو گئی تھیں فوج اسلامی میں داخل نہیں کیا گیا۔ اور دوسری طرف یہ دعوے کرنا کہ باغی اقوام کو لوٹ مار کا شغل دینے کے لئے ایران اور شام سے چھیڑ چھاڑ شروع کی گئی صاف بتاتا ہے کہ یہ دعویٰ محض ایک افسانہ ہے۔ جو تاریخی واقعات کی بنا پر نہیں بلکہ تعصب کی رنگین عینک نے بنا لیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بعد میں جب ایران اور رومن ایمپائر کی بے شمار فوجیں میدان جنگ میں نکل پڑیں۔ تو اسلامی فوج کو بڑھانے کی ضرورت پیش آئی اور اس وقت ان اقوام کو بھی فوج میں داخل کر لیا گیا جنہوں نے بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ مگر بعد کے واقعات سے حضرت ابوبکر کی نیت اور ارادہ پر استدلال کرنا تمام دنیا کے اصول شہادت کے خلاف ہے۔ حضرت ابوبکر کو کیا ضرورت پیش آئی آپ کا کیا ارادہ تھا۔ اس پر دلیل ان واقعات سے ہی لی جا سکتی ہے جو آپ کے اس فعل سے پہلے پیش آچکے تھے نہ ان واقعات سے جو بعد میں کسی قدر آپ کے زمانہ میں مگر بیشتر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پیش آئے۔

خلافت اسلامیہ اور ایران و روما کی طاقت کا موازنہ۔

سوال یہ ہے کہ لڑائی شروع ہونے کے وقت کیا حالات تھے۔ ان تاریخی حالات کو جو شخص ایک سرسری نگاہ سے بھی دیکھیگا

وہ فوراً بول اُٹھے گا کہ ان حالات میں دوسری قوموں پر پھر زبردست سلطنتوں پر جن کے نام سے ہی عرب لوگ خائف تھے حملہ کرنے کا وہم بھی حضرت ابوبکر کے دل میں نہ آسکتا تھا۔ اور نہ آپ کے پاس کوئی ایسی زبردست فوج تھی جس کے گھمنڈ پر آپ ایران یا شام سے چھیڑ چھاڑ شروع کرنے کا خیال بھی دل میں لا سکتے۔ حیرت اس بات پر آتی ہے کہ کس طرح پر بڑے بڑے تاریخ نویس واقعات پر غور کرنے کی بجائے تعصبات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایران اور روما کی سلطنتیں اس قدر زبردست تھیں اور عرب کے بہت سے حصوں پر اس طرح متصرف تھیں کہ عربوں کی اُن کے سامنے کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔ عرب کے بہت سے مشرقی حصہ پر ایران کی حکومت تھی۔ اور شمالی حصہ کو قیصر دبائے ہوئے تھا۔ پھر یہ سلطنتیں بے شمار باقاعدہ افواج رکھتی تھیں۔ جو ہر طرح ہتھیاروں سے مسلح تھیں روپیہ دونوں کے پاس بافراط تھا۔ دنیا دونوں کی طاقت کا سکہ مانے ہوئی تھی۔ بالمقابل عرب کے لوگ اُن کے نام سے کانپتے تھے۔ عرب کی حکومت اسلامی ابھی اندرون ملک کی بغاوت سے بھی اچھی طرح فارغ نہیں ہوئی ان لوگوں پر جو بغاوت میں شامل ہوئے اسے کوئی اعتماد نہیں اور بیشتر حصہ اقوام عرب کا بغاوت میں شامل ہو گیا تھا باقاعدہ فوج کوئی نہیں اور جو ہے ان دو سلطنتوں کے بالمقابل نہ ہونے کے برابر۔ روپیہ بالکل نہیں۔ سامان جنگ کوئی نہیں۔ کیا اس کمزوری کی حالت میں حکومت اسلامی کے وہم میں بھی یہ بات آ سکتی تھی کہ اس قسم کی دو ہمسایہ سلطنتوں پر حملہ کرنے کے لئے پیش قدمی کرے۔ اور پھر ایک ہی وقت میں ان دونوں طاقتوں سے جنگ کرے۔ تاریخ اسلام کو پڑھنے والا حیرت میں رہ جاتا ہے۔ جب کبھی تو یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تن تنہا تلوار لے کر سارے ملک عرب کو نہ صرف فتح کر لیا۔ بلکہ اپنا مذہب بھی منوا لیا۔ اگر عقل انسانی اس بیہودہ خیال کو قبول کر سکتی ہے تو آج کیوں کوئی شخص اسی طرح تن تنہا نکل کر اور ساری دنیا کو حتیٰ کہ اپنی قوم اور خاندان کو بھی اپنا مخالف بنا کر تلوار سے وہی کام نہیں کر سکتا۔ اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اس نازک حالت میں سے نکلتے ہی جو حضرت ابوبکر کو زمام خلافت ہاتھ میں لیتے ہی پیش آئی حضرت ابوبکر نے یہ فیصلہ کیا کہ اب وہ زبردست سلطنتوں

پر جن کے سامنے عرب کی کچھ حقیقت نہیں حملہ کیا جائے اور وہاں اپنا مذہب بجبر منوا لیا جائے۔ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ کے ساتھ وہ ناانصافی نہیں ہوئی جو تاریخ اسلام کے ساتھ ہوئی ہے۔

ایران وشام کی لڑائیوں میں پہل کس نے کی

تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر حضرت ابوبکرؓ نے ادھر کا ارادہ ہی کیوں کیا۔ عرب کی بغاوت کو فرو کر کے انتظام ملکی میں لگ جاتے سرحدوں کی طرف کیوں بڑھے؟ میں اس کا جواب دے چکا ہوں کہ اگر آپ ایسا کرتے اور سرحد کی فکر نہ کرتے تو سلطنت اسلامی کو دونوں میں یہ دونوں ہمسایہ سلطنتیں تباہ کر دیتیں۔ سرحد کی حفاظت کرنا کیا ملکی رنگ میں اور کیا روحانی رنگ میں اسلام کی تعلیم کا ایک بڑا زبردست پہلو تھا۔ پہل نہ کرنا مگر فساد کو اس کی ابتدا میں روکنا کامیابی کا اصل گر بتایا گیا تھا یہ قرآن شریف کی تعلیم تھی۔ یہی نقشہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نظر آتا ہے یہی نقشہ آپ کے ان شاگردوں کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ جنہوں نے براہ راست آپ سے تعلیم حاصل کی اور میں کہوں گا کہ آج اسی تعلیم کو بھلا دینے سے اسی نمونہ کو مدنظر نہ رکھنے سے اسلامی سلطنتوں نے یہ نقصان اٹھایا ہے کہ اُن کی جڑیں کھوکھلی ہو گئیں۔ سرحد کی حفاظت اور اس کی مضبوطی سلطنت کے قیام کی سب سے پہلی ضرورت تھی۔ اس لئے باوجودیکہ ابھی مشکل سے بغاوت فرو ہوئی تھی اور باوجودیکہ مسلمانوں کے پاس فوج نہ تھی اور باوجودیکہ مسلمان اس خطرہ سے آگاہ تھے کہ ایران اور روما اپنی پوری طاقت کے ساتھ ان کو کچلنے کی کوشش کریں گے۔ مگر ان تمام خطرات کو اپنے فرض منصبی کے سامنے انہوں نے ہیچ سمجھا۔ اگر ایک طرف وہ حد درجہ کے محتاط تھے اور کسی قوم پر زیادتی نہ کرتے تھے تو دوسری طرف اپنے فرض منصبی کا اس قدر زبردست احساس اُن کے دلوں میں تھا۔ کہ اکیلے آدمی کو تمام دنیا سے بھی مقابلہ کرنا پڑے تو کرتا تھا۔ اگر اُن کے فرض منصبی کا تقاضا ہوتا تو جلتی ہوئی آگ میں اس خوشی سے داخل ہوتے جس طرح کوئی سبزہ زار کی طرف چلا جاتا ہے برستی ہوئی تلواروں میں اس طرح کود پڑتے جیسے کوئی تخت پر بیٹھنے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ وہ خواہ مخواہ مقابل پر نہ نکلتے تھے۔ مگر جب دشمن پہل کرے تو ساری دنیا کے

مقابلہ کو ہیچ سمجھتے تھے۔ اس لئے اپنی کمزوری کو جانتے ہوئے ایران و روما کی طاقت سے واقف ہو کر بھی جب انہوں نے دیکھا کہ دشمن پہل کرتا ہے۔ تو دنیا کی دو سب سے زبردست سلطنتوں کا ایک ہی وقت میں مقابلہ اُن کو ہیچ نظر آیا۔ میور کے الفاظ قابل غور ہیں۔

"جبھی کہ ارتداد کو فرو کیا گیا۔ پہلے کلدیہ میں اور پھر شام میں جنگی سرحدی قوموں کے ساتھ مٹ بھیڑ نے باہر کی سلطنتوں سے لڑائی کی آگ کو مشتعل کر دیا۔"

خوب یاد رکھو کہ مسلمانوں نے سلطنت روما اور ایران سے لڑائی کرنے میں پہل نہیں کی بلکہ وہ صرف اپنی سرحدوں کو درست کرنا چاہتے تھے اور ان دونوں سلطنتوں نے خود دخل دیا۔ پھر میور کے لفظ پڑھ لو۔

"کلدیہ اور جنوبی شام فی الحقیقت عرب کے حصے ہیں وہ قومیں جو ان ممالک میں آباد تھیں کسی قدر بت پرست مگر زیادہ تر (گو برائے نام ہی سہی) عیسائی، عرب قوم کا جزو لازم تھیں اور اس لحاظ سے نئے سلسلہ[1] کے فوری دائرہ عمل کے اندر تھیں لیکن جب ان کی مٹ بھیڑ سرحد کے اسلامی دستوں سے ہوئی تو ان کی حمایت میں اُنکے اپنے اپنے بادشاہ کھڑے ہو گئے۔ مغربی اقوام کی حمایت میں قیصر اور مشرقی اقوام کی حمایت میں کسریٰ۔ اس طرح پر لڑائی نے وسعت اختیار کر لی اور اسلام کا مقابلہ مشرق اور مغرب کی دو زبردست سلطنتوں سے شروع ہو گیا۔"

پس خلافت اسلامی صحیح معنے میں تعلیم قرآنی پر عمل پیرا ہوئی۔ اس نے پہل نہیں کی زیادتی نہیں کی۔ کسی قوم پر حملہ نہیں کیا۔ لیکن جب اُس نے اپنے ملک کا انتظام کرنا چاہا تو ایران اور روما دونوں اپنی افواج کے ساتھ اپنی طاقت کے گھمنڈ پر اس میں مخل ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے جس طرح پہلے ایک بیکس انسان کے ہاتھ سے ایک ملک کے ملک کو مغلوب کرا کر اپنی قدرت کا ہاتھ دکھایا تھا۔ گو وہ خود تلوار اٹھانے کے خلاف تھا اسی طرح اب ابوبکر و عمر کے زمانہ میں عرب جیسے ناکارہ ملک کے ہاتھ سے دو عظیم الشان سلطنتوں کو گرا کر اپنی قدرت کا دوسرا ہاتھ دکھایا جیسا کہ اس کا وعدہ تھا[2] اور اس کی نصرت

---

[1] یعنی اسلام [2] انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیوٰۃ الدنیا۔ (المومن ع ۵۱)

دونوں حالتوں میں اسی لئے آئی کہ ایک طرف مظلوم تھے اور دوسری طرف ظالم۔ اور ریخ نے پورے واقعات محفوظ نہیں رکھے۔ لیکن بحرین میں ایران کا کھلے طور پر نوصیر نا۔ ایک عیسائی عورت کا عیسائی اقوام کو ساتھ لیکر مدینہ پر حملہ آور ہونے کے ارادہ سے نکلنا اور عرب کے وسط تک پہنچ جانا۔ شمال کی طرف طلیحہ کا فساد برپا کرنا جہاں بائی سلطنت کا اثر تھا۔ یہ کھلے کھلے واقعات ہیں جو بتاتے ہیں کہ عرب میں جو بغاوت اس میں ایران اور روما دونوں کا ہاتھ تھا۔ بغاوت کے اثر کے نیچے عموماً وہی علاقے جو یا تو اُن کی سرحدوں سے ملتے تھے اور یا اُن کے زیر اثر تھے۔ خود یمن میں حکومت ن کا بڑا اثر تھا۔ اور کچھ تعجب نہیں کہ اس کھلی امداد کے علاوہ جو باغیان عرب کو دی ہی۔ ایرانیوں اور عیسائیوں کی خفیہ ریشہ دوانیوں نے بھی عرب میں بغاوت پھیلانے میں بہت سا کام کیا ہو۔ بالخصوص قیصر کی عیسائی سلطنت ان باتوں میں خوب مشاق تھی۔ جیسے آج بھی عیسائی سلطنتوں کی خفیہ ریشہ دوانیاں بہت کچھ ان واقعات کی تہ میں ہوتی ہیں جن سے بظاہر ان کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ اور یہ سلطنت شمال عرب کی عیسائی اقوام کو اکسا کر بہت کچھ اپنا کام نکالا کرتی تھی۔ بہرحال یہ امر قرین قیاس ہے کہ بغاوت عرب میں ان ہمسایہ سلطنتوں نے جہاں تک ممکن تھا خفیہ طور پر لوگوں کو بہت کچھ اکسایا یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں کا ایسی قوموں سے مقابلہ ہوا جو سرحد پر تھیں۔ مگر ان کے زیر تصرف نہ تھیں۔ تو قیصر و کسریٰ ہر دو نے ان کی علی الاعلان مدد کی۔ اور مسلمانوں سے جنگ کرنے میں پہل کی۔

سرحد ایمان کی لڑائیاں اور فتوحات، حیرہ پر قبضہ۔

جن واقعات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ مسلمہ طور پر صحیح واقعات ہیں۔ اس لئے یہ نتیجہ بھی یقینی طور پر صحیح ہے۔ مگر ان لڑائیوں کی وجوہات کو ابتدائی تاریخ نویسوں نے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ رسول اللہ صلعم کے زمانہ کی لڑائیوں میں بیشتر وجوہات جو ہم کو مل جاتی ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ اس وقت کے واقعات کو زیادہ تفصیل سے محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی اور ان واقعات سے ہمیں ان وجوہات کی طرف رہنمائی ہو جاتی ہے۔ لیکن آپ کے بعد اس

تفصیل کے ساتھ واقعات کو محفوظ نہیں کیا گیا۔ بلکہ اکثر اوقات بہت ہی اجمال سے کام لیا گیا ہے یہ وہ امر ہے جسے عیسائی مورخین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس لئے اگر ان لڑائیوں یا مہموں میں سے ہر ایک کی وجہ ہمیں معلوم نہ ہو تو ان نتائج سے جو موٹے موٹے مسلمہ واقعات سے اخذ کئے جائیں مدد لینی چاہئے بحرین کی بغاوت کے فرو کرنے میں ایک شخص مثنّیٰ بن حارث شیبانی نے خاص مدد دی تھی۔ اور اس کے بعد تاریخ سے ہمیں صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ شمال کی طرف خلیج فارس کے کنارے بڑھتا چلا گیا۔ مگر چونکہ ہمیں علم ہے۔ کہ بحرین کی بغاوت میں کسریٰ نے اپنی فوج سے مسلمانوں کے خلاف بنی بکر کی مدد کی تھی۔ اس لئے قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہم بحرین سے شمال کی طرف کے علاقہ کو باغیوں اور ان کے حامیوں یعنی ایرانیوں سے صاف کرنے کے لئے تھی۔ یہی وہ علاقہ تھا جس میں مثنّیٰ کی قوم آباد تھی اور چونکہ اس قوم کو اور اس کے قرب جوار کی قوموں کو ایرانیوں کے ظلم و تعدی سے سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ اس لئے ان اقوام کے ساتھ مل جانے سے مثنّیٰ کی جمعیت آٹھ ہزار ہو گئی۔ لیکن دوسری طرف ایرانی افواج تھیں۔ اس لئے حضرت ابوبکرؓ نے خالد کو جو اس وقت مسیلمہ کذاب کے مقابلہ سے فارغ ہو چکے تھے حکم دیا کہ وہ مثنّیٰ کی مدد کے لئے اُبلہ کی طرف (جو موجودہ بصرہ کے قریب تھا) بڑھے اور مثنّیٰ کو حکم دیا کہ وہ خالد کے ماتحت ہو کر کام کرے۔ اس جنگ میں ایرانی اور اسلامی افواج کا پہلا مقابلہ مقام حفیر پر اُبلہ سے کوئی پچاس میل جنوب کی طرف ہٹ کر ہوا۔ جو ایران کی سرحد پر واقع تھا ایرانی افواج کو شکست ہوئی یہ لڑائی ذات السلاسل[1] کے نام سے مشہور ہے یہاں سے خالد متواتر لڑائیاں کرتا ہوا اور الیس پر پھر ایرانیوں کو شکست دیکر فرات کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ شمال مغرب کی طرف حیرہ تک (جو موجودہ شہر کوفہ کے قریب ہے) بڑھ گیا اور دریائے فرات کے مغرب میں سارے علاقے کو جس میں خالص عرب اقوام بستی تھیں مگر ایرانیوں نے انہیں دبایا ہوا تھا۔ مسخر کیا اور ایرانی افواج کو دریائے فرات کے مشرق کی طرف عراق عرب میں دھکیل دیا۔ حیرہ میں اس وقت عیسائی حکومت تھی مگر ایرانی اس سے خراج وصول کرتے تھے خالد نے حیرہ کا محاصرہ کیا اور آخر حکومت حیرہ نے حکومت عرب کے ساتھ عہدنامہ کر کے خراج دینا منظور کیا۔

[1] اس لئے کہ ایرانی سپاہیوں نے اپنے آپ کو ایک دوسرے کے ساتھ زنجیروں سے باندھ لیا تھا۔

یہ خراج جزیہ[1] کہلایا۔ اور یہ پہلا جزیہ تھا جو اہل اسلام نے لیا۔ مقرر خراج کے علاوہ اہل حیرہ نے کچھ تحائف بھی پیش کئے حضرت ابوبکرؓ نے تحائف قبول کر لئے مگر ان کی قیمت جزیہ کی مقررہ رقم سے وضع کر دی ایسی مثالوں کے ہوتے ہوئے یہ کس قدر شرمناک ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ایرانیوں کی دولت دیکھکر عرب لوگ اندھے ہو گئے تھے اور صرف لوٹ مار کے لالچ سے فوجیں آگے بڑھتی چلی جاتی تھیں۔ پہلے ایرانیوں کی دولت عربوں سے مخفی نہ تھی ایرانیوں کی حکومت عرب کے حصوں پر تھی۔ یہی اقوام پہلے بھی وہاں رہتی تھیں یہ سچ ہے کہ شکست خوردہ فوج کے مال ومتاع وذخائر کے مسلمان مالک ہوتے تھے۔ لیکن کیا آج مہذب فاتح افواج شکست خوردہ فوج کے اموال وذخائر کو معافی مانگ کر ان کے پاس بھیج دیتی ہیں؟ مال غنیمت آج بھی فاتح فوج ہی حاصل کرتی ہے۔ مسلمانوں کو بھی فتح ہوتی تھی تو مال غنیمت ہاتھ آتا تھا اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتے تھے لیکن ان کے دلوں کی کیا حالت تھی کیا اس مال غنیمت کو دیکھکر اور لالچ پیدا ہوتا تھا کہ بہت مال حاصل کریں لڑانے والے تو حضرت ابوبکر و عمر تھے جنہوں نے نہ صرف اس مال غنیمت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ بلکہ حضرت عمر کے سامنے جب ایران اور شام کی فتوحات کے بعد جواہرات اور خزانے اور سامان آتا تو آپ رو پڑتے اور فرماتے کہ مجھے ڈر ہے کہ یہ آسایش کے سامان جو مسلمانوں میں آرہے ہیں یہ اُن کی تباہی کا موجب نہ ہوں۔ جس شخص کی یہ قلبی کیفیت ہو کیا وہ مال غنیمت

> مسلمان افواج پر لوٹ مار کا غلط الزام۔

---

[1] جزیہ۔ یہ لفظ جزا سے نکلا ہے۔ جس کے معنی بدلا ہیں۔ اور چونکہ یہ ایک ٹیکس تھا جو غیر مسلموں سے ان کی جان و مال کی حفاظت کے بدلے میں لیا جاتا تھا۔ اس لئے یہ جزیہ کہلاتا تھا حفاظت ملک کیلئے مسلمان اپنی جان دیتے تھے اور فوجی خدمت اُنکے لئے لازمی تھی۔ مگر غیر مسلموں سے بجائے فوجی خدمت کے کچھ ٹیکس لیا جاتا تھا۔ ان دونوں میں سے سہل کونسی چیز تھی ہر ایک شخص خود سمجھ سکتا ہے آج جن ممالک میں لازمی فوجی خدمت ہے وہاں اگر کچھ روپیہ اس کے عوض لیا جائے تو بہت لوگ جو مہیا کر سکتے ہیں ایسی خوشی سے دینے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ بیس سال سے کم پچاس سال سے زیادہ عمر کے مردوں سے عورتوں سے بچوں دائم المریض لوگوں سے نابیناؤں سے مفلسوں سے جزیہ وصول نہ کیا جاتا تھا۔

کی خاطر ایک دن بھی لڑائی جاری رکھ سکتا ہے۔ لیکن وہی لوگ جو مسلمانوں کے مال غنیمت کا نام لوٹ مار رکھتے ہیں۔ خود مال غنیمت کا فخریہ اخبارات میں اعلان کرتے اور ہضم کر جاتے ہیں۔ اگر مسلمان لوٹ مار کے لئے گھر سے نکلتے تو مفتوحہ علاقوں میں بھی یہی ان کا طریق عمل ہوتا۔ ناممکن تھا کہ جس فوج کی غرض ہی لوٹ مار ہو وہ رعایا کے مال کی حفاظت اس طرح کرے کہ ملک شام کے عیسائی مسلمانوں کی حکومت کو عیسائیوں کی حکومت پر ترجیح دیں اور ملک ایران کے آتش پرست مسلمانوں کی حکومت کے جوئے کو اپنی قوم کی نسبت سہل سمجھیں۔ خود میور کو اس بات کا اعتراف کرنا پڑا ہے چنانچہ وہ اپنی تاریخ خلافت میں لکھتا ہے۔

"شام کے لوگ مذہبی ایذا رسانی کے علاوہ جس کا انہیں شکار بنایا گیا۔ زیادتی ٹیکس کی وجہ سے بھی مصیبت میں تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اُن کے ملک پر حملہ ہوا تو وہ خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ بلکہ ان کو عربوں کی حکومت سے زیادہ امید تھی جو لوٹ مار نہ کرتے تھے۔ اور جن کی حکومت میں نرمی اور برداشت زیادہ تھی"

اور تعجب یہ ہے کہ ایران کی لڑائیوں میں مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو عیسائی بھی ایرانیوں سے لڑتے تھے مگر کسی عیسائی مؤرخ کی قلم سے یہ لفظ نہیں نکلے کہ یہ عیسائی بھی لوٹ مار کے لالچ سے شامل ہوئے تھے۔

حیرہ سے خالد اوپر کی طرف بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ دریائے فرات کے کنارے

انبار اور عین التمر کی تسخیر

بابل سے کوئی اسی میل اوپر قلعہ انبار کا محاصرہ کر کے اسے مسخر کیا اور وہاں سے جانب غرب عین التمر کی طرف بڑھا جو تین منزل کے فاصلہ پر ہے یہ وہ مقام ہے جو بنی تغلب کی شورش کا مرکز تھا اور جہاں سے بنی تغلب قوم کو ساتھ لیکر سجاح مدعیہ نبوت مدینہ پر حملہ کے لئے نکلی تھی اور آخر وسط عرب سے واپس ہوئی تھی۔ بنی تغلب کے ساتھ دوسری عرب اقوام بھی مل گئی تھیں اور ایرانی افواج بھی ان کی پشت پر تھیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلی مرتبہ سجاح کا یہاں سے نکلنا اور عرب پر حملہ آور ہونا بھی ایرانی حکومت کے ایماء کے بغیر نہ تھا۔ اور ملک کا یہ حصہ شورش سے صاف

نہ ہوسکتا تھا۔ جب تک کہ اس مرکز شورش کو مسخر نہ کیا جاتا یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ خالد نے فرات کے سارے مغربی کنارے کو صاف کیا۔ تاکہ ان اقوام سے آئندہ کے لئے اہل عرب کو خطرہ نہ رہے۔ اور کوئی بین الاقوامی قانون نہیں جو خالد کے عین التمر تک فرات کے مغرب کی طرف کے علاقہ کو اہل شورش سے صاف کرنے کو زیادتی قرار دے۔ جب اسی علاقہ سے افواج نکل کر عرب پر حملہ آور ہوچکی تھیں عین التمر پر بھی اسلامی افواج کو فتح حاصل ہوئی اور خالد کچھ دیر کے لئے یہاں مقیم ہوگئے۔

سرحد شام کی لڑائیاں

اب ہم سرحد شام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ سرحد ایران پر خطرہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیدا ہوا۔ لیکن شام کی سرحد پر اس سے بہت پہلے شورش ہوچکی تھی۔ رئیس بصریٰ کے ساتھ مسلمانوں کی ایک لڑائی ۸ھ میں ہوچکی تھی۔ اس کے بعد جب قیصر کی طرف سے تیاری کی خبر نبی صلعم کو پہنچی تو ۹ھ میں آپ تبوک تک تیس ہزار آدمی کے ساتھ گئے۔ لیکن چونکہ دشمن کا اجتماع نہ پایا اس لئے بغیر جنگ کرنے کے واپس آگئے۔ اپنی وفات سے دو روز پیشتر اسامہ کے تحت پھر ایک لشکر سرحد شام کے لئے آپ نے تیار کیا۔ ان تمام واقعات سے ظاہر ہے کہ سرحد شام کی عیسائی اقوام اور خود قیصر ایران سے بھی زیادہ حکومت اسلامی کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے اور اندر اندر ریشہ دوانیاں کرتے رہتے تھے۔ اور اس طرف سے عرب پر حملہ کا ہونا ایران کی نسبت بہت آسان تھا۔ کیونکہ مدینہ سے سرحد شام سرحد ایران کی نسبت بہت قریب تھی۔ اور رستہ بھی اچھا تھا حضرت عمر کا سوال جو واقعہ ایلاء میں کتب حدیث میں مذکور ہے۔ کہ جب کسی شخص نے آپ سے کہا کہ امر عظیم پیش آگیا تو آپ نے دریافت کیا کہ کیا غسانی آگئے۔ (یہ شمال عرب کی عیسائی قوم تھی) صاف بتاتا ہے کہ مسلمانوں کو یہ خطرہ واقعی تھا۔ اسی لئے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کبھی اس طرف سے مطمئن نہیں ہوئے اور آپ نے تین دفعہ اپنی زندگی میں اس طرف افواج بھیجیں اور ایک مرتبہ بنفس نفیس بھی تشریف لے گئے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ خواہ مخواہ جنگ چھیڑنا نہ چاہتے تھے۔ اگر آپ کا ارادہ ملک گیری کا ہوتا تو جب تیس ہزار آدمی کو ساتھ لے کر

تبوک پہنچے تھے اور آگے مقابلہ کے لئے دشمن بھی موجود نہ تھا۔ تو بڑی آسانی سے جس قدر چاہتے بڑھتے چلے جاتے۔ مگر آپ کا عمل ہمیشہ اسی پر رہا کہ دشمن پہل کرے تو مسلمان جنگ کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسامہ کا لشکر عرب میں خطرناک بغاوت کے باوجود سرحد شام پر جانے سے نہیں روکا گیا۔ جس سے ظاہر ہے کہ عرب کی بغاوت سے شام کا خطرہ کچھ کم نہ تھا۔ اسامہ کے لشکر کی واپسی پر جب اطراف عرب میں مہمات بھیجی گئیں تو ایک مہم سرحد شام کی طرف بھی خالد بن سعید کے ماتحت بھیجی گئی اور خالد بن سعید کو حضرت ابوبکر نے صاف الفاظ میں حکم دیا کہ خود حملہ نہ کرے۔ بلکہ اگر دشمن حملہ کرے تو جواب دے۔ اس سے پیشتر بھی میں دکھا چکا ہوں کہ قیصر کی سلطنت پر حملہ کرنے کا وہم بھی ان حالات میں مسلمانوں کے دل میں نہ آسکتا تھا۔ جب وہ خود چاروں طرف سے مصائب کا آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ اور حضرت ابوبکر کی ان تمام مہمات کی غرض صاف طور پر مسلمانوں کو بچانا اور عرب کو شورش سے صاف کرنا تھا۔ اور شام کی فوج کو یہ حکم دینا صاف بتاتا ہے کہ آپ کا منشا یہ نہ تھا کہ حکومت قیصر سے چھیڑ چھاڑ کی جائے بلکہ آپ یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ حکومت قیصر کے دل میں یہ بدظنی ہو کہ مسلمان ان پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پس آپ کی سرحد شام کی پہلی مہم صاف طور پر دفاعی تھی۔ اور اس سے قطعاً کوئی جارحانہ کارروائی مدنظر نہ تھی لیکن حکومت قیصر جو پہلے سے ہی اسلام کے پھیلنے کو اور اسلام کی حکومت کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی اور اس سے پہلے کئی دفعہ آمادہ کارزار ہو چکی تھی اور سرحد کی اقوام کو اکسا کر اپنا کام نکالتی رہتی تھی۔ اب مسلمانوں کی کمزوری اور عرب کی بغاوت کو دیکھ کر اس نے یہ خیال کیا۔ کہ یہ شکار اس وقت مارا جا سکتا ہے۔ اور باوجود اس کے کہ خالد بن سعید نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ رومیوں نے ایک طرف بدوی اقوام کو اکسایا۔ اور دوسری طرف خود حملہ کے لئے تیار ہو گئے اس پر حضرت ابوبکر کو قیصر کے ساتھ اعلان جنگ کرنا پڑا اور اسی بنا پر مزید کمک روانہ کی گئی۔

جنگ شام کے واقعات میں بہت کچھ گڑبڑ ہے۔ لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیصر سنہ ۱۳ھ

اجنادین کی لڑائی کے ساتھ لڑائی کا آخری فیصلہ ۱۳ھ کے شروع میں ہوا۔ اور اس وقت مسلمانوں کا لشکر تین چار حصوں میں فلسطین کی طرف بڑھا۔ اور ساتھ ہی خالد بن ولید کو جو عین التمر میں مقیم تھے اور سرحد ایران کو صاف کر چکے تھے حکم ہوا کہ سرحد ایران پر مثنیٰ کو چھوڑ کر خود نصف فوج کو لے کر شام کی فوج کے ساتھ مل جائیں۔ اسلامی فوج کل ملا کر چالیس ہزار تک پہنچتی تھی مگر قیصر کی فوج کا اندازہ دو لاکھ چالیس ہزار ہے۔ اجنادین کے مقام پر دونوں فوجوں کا اجتماع ہوا۔ تین ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ مگر میدان اُن کے ہاتھ رہا۔ یہ ۲۸ جمادی الاولی ۱۳ھ کا واقعہ ہے۔ اس شکست کے بعد ہرقل نے انطاکیہ میں جا پناہ لی اور خالد نے یہاں سے بڑھ کر دمشق کا محاصرہ کیا۔ لیکن اس کا تعلق حضرت عمرؓ کے زمانے سے ہے۔ اجنادین کی فتح کی خبر مدینہ میں اس وقت پہنچی جب حضرت ابوبکر حالت نزع میں تھے۔

حضرت ابوبکر کی وفات اور حضرت عمر کا جانشین ہونا

۷ جمادی الثانی ۱۳ھ پیر کے دن حضرت ابوبکرؓ بیمار ہوئے جب بیماری نے طول پکڑا تو آپ نے اپنے جانشین کے متعلق بڑے بڑے صحابہ سے رائے طلب کی۔ جس طرح آنحضرت صلعم کے بعد سب نگاہیں حضرت ابوبکر کی طرف اٹھتی تھیں۔ اسی طرح حضرت ابوبکر کے بعد حضرت عمر کی طرف ہی سب کا خیال تھا۔ اور زمانہ خلافت ابوبکر میں بھی تمام کام حضرت عمر کے مشورہ سے ہی ہوتے تھے۔ حضرت ابوبکر نے عبدالرحمٰن بن عوف سے پھر حضرت عثمانؓ سے دریافت کیا تو دونوں نے کہا کہ حضرت عمر ہی اس کام کے اہل ہیں۔ اس کے بعد آپ نے سعید بن زید اور اسید بن حضیر اور دیگر مہاجرین و انصار سے مشورہ کیا تو سب نے بالاتفاق یہی مشورہ دیا کہ عمر ہی اس کام کے سب سے زیادہ اہل ہیں۔ بعض لوگوں کو یہ خیال تھا کہ اُن کی طبیعت میں سختی ہے اور ایک شخص نے حضرت ابوبکر سے یہ کہا تو آپ نے فرمایا کہ جب کام اُن کے سر پر ہوگا تو وہ خود نرم ہو جائیں گے۔ غرض حضرت ابوبکر نے قوم کے مشورہ سے حضرت عمر کو اپنی زندگی میں خلیفہ مقرر کیا اور پندرہ دن بیمار رہ کر ۲۲ جمادی الثانی منگل کی رات جان بحق ہوئے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن ہوئے

جس رفاقت کو زندگی میں کمال تک نباہا تھا وفات کے بعد بھی وہی رفاقت قائم رہی۔

ساوگی اور اخلاص

حضرت ابو بکر کی عادات نہایت سادہ تھیں بادشاہ ہو کر آپ نے ایسی فقیرانہ زندگی کو قائم رکھا جو انبیاء یا اُن کے خلفاء کے شایان شان ہے۔ وہی سادہ لباس وہی سادہ مکان اور خوراک۔ اسی طرح اپنے ہاتھ سے سب کام کر لیتا۔ بلکہ دوسروں کے کام بھی کر دیتا جس طرح زمانہ خلافت سے پہلے کرتے تھے جس طرح بادشاہت نے نبی کریم صلعم کی زندگی میں ادنیٰ سے ادنیٰ تغیر پیدا نہیں کیا۔ اسی طرح حضرت ابو بکر کی زندگی بھی بادشاہت کے زمانہ میں ویسی ہی سادہ نظر آتی ہے جیسے اس سے پہلے۔ اور اگر بادشاہ ہو کر فقیرانہ زندگی بسر کرنے کا نمونہ آنحضرت صلعم نے دکھایا تو آپ کے سب سے بڑے شاگرد اور رفیق حضرت ابو بکر نے بھی بادشاہت کی حالت میں آپ کے نقش قدم پر چل کر دکھا دیا کہ کس طرح انبیاء اپنے شاگردوں کو بھی ان بلند مقامات پر پہنچا دیتے ہیں جن پر وہ خود پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب خلیفہ مقرر ہوئے تو اگلے دن حسب معمول تجارت کا مال لیکر بازار کا رُخ کیا۔ راستہ میں حضرت عمر ملے اور کہا کہ اب آپ کے سر پر بہت بڑھ کر ذمہ واری کے کام ہیں شغل تجارت ان کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا۔ تو آپ نے فرمایا اہل و عیال کا گذارہ کس طرح ہو۔ اس پر صحابہ نے مشورہ کر کے اور آپ کے اخراجات کا حساب کر کے وظیفہ مقرر کر دیا جو شروع میں اڑھائی ہزار درہم سالانہ تھا۔ لیکن بالآخر غالباً پانچ سو درہم ماہوار تک کر دیا گیا۔ وفات کے وقت آپ کے پاس ایک اونٹنی اور ایک پرانی چادر بیت المال کی تھی۔ سو وہ آپ نے حضرت عمر کو بھیج دیئے۔ کفن کے متعلق فرمایا کہ پرانے کپڑے ہیں ہی دھو کر کفن پہنا دینا۔ نئے کپڑے کے مردوں سے زیادہ زندے محتاج ہیں۔ آپکے اخلاص اور طاعت رسول کو سر ولیم میور نے اس بات کی دلیل ٹھیرا دیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مفتری نہ تھے ورنہ ابو بکر جیسا ذہین اور معاملہ فہم انسان اپنا مال و جان اس طرح پر آپ پر قربان نہ کر سکتا تھا۔ اور نہ اس قدر اخلاص و محبت سے آپ کی اطاعت کر سکتا تھا۔ ایک سخت مخالف اسلام کی یہ شہادت اُن لوگوں کیلئے بالخصوص

قابل توجہ ہے جو بعض چھوٹے چھوٹے اعتراضات پر حضرت ابوبکر جیسے پاک اور راستباز انسان کے متعلق دلوں میں بغض رکھتے ہیں۔ آپ کو خدا تعالیٰ نے وہی نصرت دی جو وہ انبیاء کو دیتا ہے اور آپ کے ہاتھ سے ملک عرب میں اسلام از سر نو زندہ ہوا۔ آپ نے خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کو اس حد تک پہنچایا جو ایک امتی کا کمال ہے۔ آپ کی محبت الٰہی اس کمال تک پہنچی ہوئی تھی جس کے سامنے دنیا کی دولت اور مرتبہ کی طرف آپ نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اور اس جذبہ محبت الٰہی کے سامنے جو آپ کے سینہ میں موجزن تھا تمام دنیا کی کششیں ہیچ تھیں۔ آپ کے اخلاص اطاعت خدا و رسول۔ سادگی۔ بلند اخلاق عزم۔ استقلال۔ ایمان کے مداح دشمنان اسلام بھی ہیں، اسلام کے پیروؤں کے لئے یہ زیبا نہیں کہ وہ اپنے دلوں میں ایسے انسان کے متعلق کوئی نفرت کا خیال رکھیں۔

جمع قرآن

آپ کے سوا دو سال کے زمانہ خلافت میں اسلام کو از سر نو زندگی ملی اور عرب کی بغاوت فرو ہو کر خلافت اسلامی کا قیام ہوا۔ بلکہ اس قدر قوت و شوکت اس میں آگئی کہ جب ضرورت پیش آئی تو قیصر و کسریٰ دنیا کی دو سب سے بڑی سلطنتوں کے مالکوں سے اس حکومت نے ایک ہی وقت میں مقابلہ کر کے ان کو نیچا دکھایا۔ لیکن اگر ایک طرف حکومت کے استحکام کو اس حد تک پہنچایا تو دوسری طرف دین کی دوسری ضروریات سے بھی آپ غافل نہ تھے۔ جمع قرآن کا کام آپ کے زمانہ خلافت میں ہی ہوا۔ جمع قرآن کے نام سے بہت لوگوں کو غلطی لگتی ہے۔ جمع قرآن سے مراد ان تحریروں کا ایک جا جمع کیا جانا ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نزول قرآن کے ساتھ ساتھ لکھوائیں۔ جب کوئی آیت یا سورت نازل ہوتی تھی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اسے لکھوا دیتے تھے۔ اور دوسری طرف حفظ کرا دیتے تھے۔ یوں قرآن کریم کی حفاظت دو طرح پر ساتھ کے ساتھ ہوتی تھی ایک تحریر میں ایک حافظوں کے سینوں میں۔ اب یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ بعض سورتوں کا نزول کئی کئی سال تک رہا۔ تو آنحضرت صلعم جب کسی نازل شدہ آیت کو حفظ کراتے تو اس کے ساتھ ہی یہ بتا دیتے کہ اس کو فلاں موقعہ پر فلاں سورت میں رکھو۔ چنانچہ سورتوں میں آیتوں کی ساری ترتیب آپ کے حکم سے ہوتی۔ اسی ترتیب سے آپ خود نماز میں قرآن شریف پڑھتے تھے۔ اور اسی ترتیب سے حافظ

لوگ قرآن شریف حفظ کرتے تھے اسی طرح سورتوں کی ترتیب بھی آپ کے حکم سے ہوئی۔ اور حافظ اسی ترتیب سے قرآن شریف کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے تھے جس ترتیب سے آج لکھا ہوا کلام پاک موجود ہے۔ لیکن تحریروں کو ابھی ایک جگہ جمع نہ کیا جاسکتا تھا اور یہ تحریریں لکھی ہوئی بھی متفرق چیزوں پر تھیں کہیں کھجور کی ٹہنیوں پر کہیں کاغذوں پر کہیں چمڑے پر اس لئے اُن میں وہ ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نہ دی گئی اور نہ دی جا سکتی تھی۔ جس ترتیب سے قرآن کریم حفظ کرایا گیا تھا۔ کیونکہ آپ کی زندگی میں قرآن شریف کا نزول جاری تھا۔ پس جب جنگ یمامہ میں بہت سے حافظ قرآن شہید ہوگئے تو حضرت عمر نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ قرآن کریم کی تحریریں بھی جو رسول اللہ صلعم نے لکھوائی ہیں۔ ایک جگہ اسی ترتیب سے جمع ہونی چاہئیں تاکہ اگر حافظ سب شہید بھی ہو جائیں تو قرآن کریم اپنی ترتیب کے ساتھ تحریر میں محفوظ رہے۔ آخر کار اس کام پر زید بن ثابت کو مقرر کیا گیا جنہوں نے مدنی سورتوں کا اکثر حصہ لکھا تھا اور انہوں نے ان تمام تحریروں کو اس ترتیب سے ایک مصحف میں جمع کر دیا اور جن جن چیزوں پر وہ تحریریں دستیاب ہوئیں ان کو سی کر اکٹھا کر دیا۔ تاکہ اصل تحریریں جو نبی کریم صلعم کے حکم سے ہوئیں ایک جگہ اسی ترتیب سے محفوظ ہو جائیں۔ جمع قرآن سے صرف اسی قدر مطلب ہے اس کی غرض صرف یہ تھی کہ اگر خدانخواستہ حافظان قرآن کے سب قتل بھی ہو جائیں تو قرآن کریم کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو جائے گویا جس طرح حافظان قرآن کے سینے میں باترتیب یہ قرآن شریف موجود تھا۔ اسی طرح اصل تحریروں کو بھی اکٹھا کرکے اسی ترتیب میں رکھا جائے اسی نسخہ سے حضرت عثمان نے اپنے زمانہ میں چار نقلیں کرا کر چار مرکزوں میں رکھوا دیں تاکہ قرآن کریم کے جو نسخے لکھے جائیں اُنکا مقابلہ وہاں ہو سکے اور کسی قسم کی غلطی کتابت کی یا اور قسم کی قرآن شریف کے مسودات میں راہ نہ پا سکے۔

جمع زکوٰۃ دوسرا عظیم الشان کام جو حضرت ابوبکر نے کیا وہ زکوٰۃ کا ایک بیت المال میں جمع کرنا تھا جب جھوٹے مدعیان نبوت نے عرب کی اطراف میں بغاوت پھیلا دی تو بعض ان مسلمانوں کو جنہوں نے اسلام ابھی جلدی ہی قبول کیا تھا یہ خیال گذرا کہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر زکوٰۃ کے ٹیکس سے آزادی حاصل کی جائے۔ حضرت عمر کا مشورہ یہ تھا کہ ان لوگوں

سے نرمی کی جائے کیونکہ اس وقت بغاوت ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اور ان لوگوں کے بھی ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ تھا۔ مگر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ زکوٰۃ کا ایک حبہ بھی بیت المال سے باہر نہیں رکھا جا سکتا۔ فی الحقیقت زکوٰۃ کے ایک جگہ جمع ہونے سے ہی اسلام کی قوت و وحدت اور اسلام کی حکومت کا نظام قایم رہ سکتا تھا۔ اگر حضرت ابوبکرؓ اس وقت زکوٰۃ کے ایک جگہ جمع کرنے کے اصول کو ترک کر دیتے تو اسلام کی طاقت شروع میں ہی پراگندہ ہو کر زائل ہو جاتی۔ اور خلافت اسلامی کا محض ایک ڈھانچہ باقی رہ جاتا۔ جس کا چند دنوں میں خاتمہ ہو جاتا مگر آپ نے فرمایا میں اُن لوگوں سے جو زکوٰۃ بیت المال میں ادا نہیں کریں گے جنگ کروں گا۔ آج بھی اگر مسلمان اس طرف توجہ کریں اور بیت المال قایم کر کے زکوٰۃ ایک جگہ جمع کریں۔ تو اس سے قوم کی قوت دنوں میں کہیں کی کہیں پہنچ سکتی ہے اور نہ صرف غربا و مساکین کی خبر گیری اور دین کی دوسری ضروریات پوری ہو سکتی ہیں بلکہ قوم کے اندر اعلیٰ درجہ کا نظام وحدت پیدا ہو سکتا ہے۔

شوریٰ اور کثرت رائے

تیسرا عظیم الشان کام جو استحکام اسلام کے لئے حضرت ابوبکرؓ نے کیا وہ اصول شوریٰ کا قایم کرنا تھا آپ کے زمانہ میں سب کام مشورہ سے طے ہوتے رہے اور اہم امور اور مسائل پر ہمیشہ شوریٰ ہو کر کثرت رائے سے فیصلہ ہوتا تھا۔ آپ کا طریق عمل یہ تھا کہ جب کوئی معاملہ پیش آتا تو اول اُس کے لئے قرآن کو دیکھتے اگر وہاں نہ ملتا تو رسول اللہ صلعم کے قول و عمل کو دیکھتے۔ اور وہاں بھی نہ ملتا تو بڑے بڑے صحابہ کو بُلا کر اُن سے مشورہ کرتے پھر جس بات پر اُنکے بڑے حصہ کا اجتماع ہوتا اس پر عمل کرتے یہی طریق عمل حضرت عمرؓ کا رہا البتہ جس بات میں قرآن کریم کا یا رسول اللہ صلعم کا کوئی صریح حکم ہو اس میں مشورہ کی ضرورت نہ سمجھتے تھے یہی وجہ تھی کہ باوجود صحابہ کی مخالفت کے، آپ نے اسامہ کے لشکر کو نہ روکا کیونکہ آپ نے فرمایا کہ یہ لشکر رسول اللہ صلعم کے حکم سے تیار ہوا ہے۔ اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ ایسا ہی اسامہ کی جگہ دوسرا افسر مقرر کرنے سے بھی انکار کیا۔ کیونکہ وہ بھی رسول اللہ صلعم کا حکم تھا۔ لیکن جہاں صراحت سے کوئی بات موجود نہ ہوتی وہاں آپ کا طرز عمل شوریٰ تھا۔ اور شوریٰ میں وہی بات قابل عمل قرار پاتی جس پر سب کا یا زیادہ حصہ کا اجتماع ہو۔

یعنی فیصلے اتفاق رائے یا کثرت رائے سے ہوتے تھے۔ ہاں اُن لوگوں میں یہ خوبی تھی کہ اگر کثیر حصہ نے ایک بات کا فیصلہ کر دیا تو پھر اپنی رائے کو چھوڑ دیتے۔ اور سب کے سب متفق ہو کر اُسی کام کی تکمیل میں لگ جاتے جسکو کثیر حصہ نے فیصلہ کیا ہو۔

آپ کے عظیم الشان کاموں میں سے یہ بھی ہے۔ کہ آپ نے بادشاہ یا خلیفہ کی حیثیت

خلیفہ یا بادشاہ کی حیثیت

کو عام مسلمانوں کی طرح رکھا۔ آپ نے اپنے آپ کو خزانہ یا بیت المال کا مالک نہیں ٹھیرایا۔ بلکہ خود اس میں سے اس قدر وظیفہ لیتے تھے جس قدر دوسروں نے مقرر کر دیا۔ آپ خود محض بحیثیت ایک امین کے بیت المال کے نگران تھے کہ اس کا مصرف صحیح طور پر ہو۔ یوں آپ نے بادشاہ یا خلیفہ کو قوم کا ملازم قرار دیا۔ اور یہ اتنا عظیم الشان کام ہے کہ اس زمانہ کے تمدن میں سوائے ایک مسلمان کے کسی دوسرے انسان کے خیال میں بھی نہ آسکتا تھا۔ پھر خلافت کو آپ نے خاندانی ورثہ نہ بننے دیا۔ چنانچہ اپنی وفات کے وقت قابل بیٹے کے موجود ہوتے ہوئے حضرت عمر کا انتخاب کیا اور پھر اس کو بھی اس وقت مکمل سمجھا جب صحابہ سے اس بارے میں رائے لے لی گئی۔ اور سب نے حضرت عمر کا انتخاب پسند کیا۔ پھر خلیفہ یا بادشاہ کو آپ نے قانون پر حاکم قرار نہیں دیا۔ بلکہ عام مسلمانوں کی طرح قانون کے ماتحت قرار دیا۔ مکہ میں تشریف لے گئے۔ تو دارندوہ کے پاس بیٹھ کر لوگوں سے فرمایا کہ اگر کسی کو میری طرف سے کسی ظلم کی شکایت ہو یا کسی کا کوئی حق مجھ پر ہو تو وہ بتا دے۔ آپ نے قانون سازی کو بادشاہ یا خلیفہ کے اختیار میں نہ دیا اول قرآن کریم کو قوم کے لئے قانون قرار دیا اس کے بعد رسول اللہ صلعم کے ارشادات کو اور اس کے بعد مجلس شوریٰ کو قانون بنانے کا مجاز ٹھیرایا۔ خلیفہ قانون کے ماتحت تھا۔ قانون خلیفہ کے ماتحت نہ تھا یہ جمہوریت کا اصل الاصول ہے۔ جس پر آپ عمل پیرا ہوئے ایک طرف بادشاہ کو ملازم قوم قرار دے کر دوسری طرف اسے ایک عام مسلمان کی طرح قانون کے ماتحت قرار دیکر آپ نے مسلمانوں میں مساوات قومی کی وہ بنیاد رکھی جس کی نظیر دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔ جب بادشاہ وقت ملازم قوم ہو جب وہ قانون کے ماتحت ہو تو اس کے عمال کا درجہ خود سمجھ میں آسکتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ حضرت علی کے بعد مسلمان غلط رستے پر

پڑ گئے بادشاہت وراثت بن گئی۔ بادشاہ خزانہ کا مالک بن گیا۔ اور آہستہ آہستہ شوریٰ کا اصول متروک ہوگیا۔ اور اسلامی سلطنت پر زوال کا موجب یہی ہوا۔

دشمنوں سے سلوک

آپ نے دشمنوں سے سلوک کے لئے بھی نہایت عمدہ مثال قایم کی۔ فوجی افسروں کو جو ہدایات دی جاتی تھیں ان میں بالخصوص ان باتوں کی طرف توجہ دلائی جاتی تھی۔

(۱) کسی بوڑھے آدمی بچہ یا عورت کو قتل نہ کیا جائے۔

(۲) راہبوں یعنی گوشہ گزین لوگوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ نہ اُن کی عبادتگاہوں کو نقصان پہنچایا جائے

(۳) مثلہ نہ کیا جائے یعنی ناک کان وغیرہ نہ کاٹے جائیں۔

(۴) کوئی پھلدار درخت نہ کاٹا جائے۔ نہ کوئی کھیت وغیرہ جلا کر برباد کئے جائیں۔ نہ کوئی آبادی ویران کی جائے۔

(۵) غیر مذاہب کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا جائے وہ پورا کیا جائے۔

(۶) جو لوگ اطاعت قبول کریں اُن کے جان و مال کے حقوق مسلمانوں کی طرح سمجھے جائیں۔

قوت فیصلہ اور قصہ فدک

فیصلہ کرنے میں آپ نے وہ قوت دکھائی کہ جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ رسول اللہ صلعم نے جو محبت آپ کو تھی وہ اظہر من الشمس ہے۔ حضرت فاطمہ کی عزت اور محبت جو آپ کے دل میں تھی اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے لیکن جب آنحضرت صلعم فوت ہوگئے تو حضرت فاطمہ نے آپ سے کہلا بھیجا کہ باغ فدک وغیرہ جائدادیں جن سے رسول اللہ صلعم اپنی گذارہ کیلئے لیا کرتے تھے شرعی طور پر تقسیم ہو کر انہیں حصہ دیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے نحن معشر الانبیاء لانورث ماترکناہ صدقۃ یعنی انبیا کا کوئی ورثہ نہیں ہوتا (کیونکہ اُن کی ذاتی جائداد کچھ نہیں ہوتی) جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے یعنی بیت المال کا حصہ ہے آنحضرت صلعم کی پیاری بیٹی کو یہ جواب دینا بڑے دل کا کام تھا۔ مگر یہاں تو

نبی کے ورثا کو یہ جواب دیا جن میں ان کی اپنی بیٹی حضرت عائشہ بھی تھیں۔ جب اپنی وفات کا وقت قریب آیا تو فرمایا کہ خلافت کے زمانہ میں بیت المال سے گذارہ لے کر جو کچھ بچ رہا ہے وہ بیت المال میں واپس کر دیا جائے۔ پس آپ کا یہ فیصلہ مسلمانوں کے لئے ایک مشعل راہ تھا کہ سخت ترین محبت حتیٰ کہ اہل بیت کی محبت بھی انہیں اصول حقہ سے منحرف نہ کرے۔

حضرت عمرؓ

۲۲ جمادی الثانی ۱۳ ہجری تا ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ ہجری

۲۴ اگست ۶۳۴ء تا ۳ نومبر ۶۴۴ء

۱۳ھ
۶۳۴ء

صحابہ کی لڑائیوں اور فتوحات پر اعتراض

ہم دکھا چکے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے سرحد ایران اور شام پر اپنی افواج کو صرف اس لئے بھیجا تھا کہ اپنی سرحد کو غیر اقوام کے حملوں اور ریشہ دوانیوں سے محفوظ کریں حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں جہاں جہاں اسلامی افواج پہنچیں وہ صرف ایسے علاقے تھے جہاں خالص عرب اقوام آباد تھیں۔ حضرت عمرؓ نے نہ صرف اس استحکام کو جاری رکھا بلکہ اس قدر قوت سے اسکا اتباع کیا کہ ایران اور روما کی دو عظیم الشان سلطنتوں کے بڑے حصے کو فتح کر کے عرب کی حکومت کے نیچے لے آئے۔ ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ اگر حضرت ابو بکرؓ نے یہ کام محض سرحدات کے استحکام کے لئے کیا تھا تو جب وہ غرض حاصل ہو گئی تھی فوراً لڑائی کو بند کیوں نہ کر دیا گیا۔ اور کیوں سارے ایران۔ ملک شام کے شمالی حصہ اور مصر کو فتح کر کے سلطنت اسلام کا حصہ بنایا گیا۔ یہ اعتراض غیر مسلم مورخین نے کیا بھی ہے لیکن ایسا اعتراض صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو فطرت انسانی اور قوانین جنگ سے ناواقف ہونے کے علاوہ تاریخ اسلامی کے واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کر لے۔ فی الحقیقت مسلمانوں نے بارہا چاہا کہ جنگ بند ہو مگر ایرانیوں اور رومیوں نے خود بار بار حملے کر کے انہیں لڑائی

کیلئے مجبور کیا۔

حضرت عمرؓ کا فیصلہ کن قول۔ لڑائیوں کی غرض صرف حفاظت قوم تھی۔

جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں اور جیسا کہ سب مورخین کو اعتراف ہے اس زمانہ کی تاریخ کے مفصل واقعات اس قدر یقینی شہادت کے ساتھ ہم تک نہیں پہنچے۔ جس طرح رسول اللہ صلعم کے زمانہ کے واقعات پہنچے ہیں۔ تاریخیں عموماً اس زمانہ میں لکھی گئیں جب اسلام کی سلطنت روئے زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس وقت اُن کے گرد و پیش کے حالات ایسے تھے بلکہ ان کی دماغی کیفیت ایسی ہو چکی تھی کہ یہ سوال بھی اُن کے دل میں پیدا نہ ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے ہمسایوں سے کیا کیا تکلیفیں پہنچی تھیں جن کی وجہ سے انہیں قدم آگے بڑھانا پڑا۔ اگر اس زمانہ کے تفصیلی واقعات موجود ہوتے تو بھی آج ایک مورخ اُن سے یہ پتہ لگا سکتا تھا لیکن نہ یہ سوال پہلے مورخین کے سامنے آیا اور نہ ہی وہ تفصیلات موجود ہیں جن سے آج اس سوال کے سارے پہلوؤں کو ہم حل کر سکیں۔ لیکن پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ میں کہیں کہیں کوئی بات ایسی محفوظ رہ گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنا قدم حدود عرب سے آگے بڑھائیں اور کوئی مجبوریاں تھیں جن کی وجہ سے انہیں ایسا کرنا پڑا۔ سب مورخین لکھتے ہیں کہ عراق عرب کے فتح ہو جانے کے بعد حضرت عمر اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "ہمارے اور فارس کے درمیان آتشین پہاڑ حایل ہوتا تو اچھا ہوتا۔" اور میور نے اپنی تاریخ خلافت میں لکھا ہے کہ جب زیاد نے حضرت عمر سے اجازت چاہی کہ حدود عراق سے نکل کر خراسان میں ایرانی افواج کا تعاقب کرے تو حضرت عمر نے روک دیا اور فرمایا کہ "میں چاہتا ہوں کہ عراق عرب اور اس سے پرے جو ممالک ہیں ان کے درمیان پہاڑوں کی روک ہوتا کہ نہ ایرانی ہم تک پہنچ سکیں اور نہ ہم ان تک پہنچیں۔ ہمارے لئے عراق عرب کافی ہے میں اپنی قوم کی حفاظت کو ہزاروں غنیمتوں اور مزید فتوحات پر مقدم رکھتا ہوں۔" ان الفاظ پر عیسائی مورخ کہتا ہے کہ "وہ ابھی تک ایک عالمگیر تبلیغ کا خیال پختہ نہ ہوا تھا۔ اور اسلام کو ایک عام مذہبی لڑائی کے ذریعہ سے بجبر لوگوں سے منوانے کا خیال مسلم قلب میں پیدا نہ ہوا تھا۔" جائے غور ہے کہ حضرت عمر کے

یہ الفاظ ۱۶ھ کے ہیں اس وقت ملک شام اور عراق عرب دونوں فتح ہو چکے تھے اس سے کم سے کم اتنا تو ایک غیر مسلم مورخ کی شہادت سے بھی ثابت ہو گیا کہ عراق عرب اور شام کی فتح تک مسلمانوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا نہ ہوا تھا کہ اسلام کو بجبر تلوار کے ساتھ دنیا میں پھیلایا جائے۔ اس لئے حضرت ابوبکر کے وقت میں سرحد ایران اور شام پر افواج بھیجے ہیں اور پھر تین سال تک حضرت عمر کے زمانہ کی لڑائیوں میں یہاں تک کہ عراق عرب اور شام بھی فتح ہو گئے۔ وجوہات ملکی تھیں اور اصل غرض صرف اپنی قوم کی حفاظت تھی۔ ان وجوہات پر حضرت عمر کے الفاظ کافی سے زیادہ روشنی ڈالتے ہیں "میں ہزاروں غنیمتوں اور مزید فتوحات پر اپنی قوم کی حفاظت کو مقدم سمجھتا ہوں" گویا نہ اسلام کا بجبر پھیلانا مقصود تھا نہ ہی فتوحات ملکی کا کوئی خیال تھا نہ ہی مال غنیمت کے حصول کا کوئی خیال تھا بلکہ اصل خیال ایک ہی تھا۔ "اپنی قوم کی حفاظت" حضرت عمر ہی حضرت ابوبکر کے زمانہ میں بھی سب سے بڑے مشیر کار اور مہمات ملکی کے ذمہ دار تھے۔ جب وہ صاف طور پر اپنے منشا کا اعلان کرتے ہیں۔ اور یہ واقعہ تاریخ میں محفوظ ہے تو کس قدر ظلم ہے کہ قیاسات دوڑا کر ان لڑائیوں کی وجہ کبھی یہ بنائی جائے کہ مسلمان لوٹ مار کر کے مال حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور کبھی یہ کہ اپنے دین کو بجبر لوگوں سے منوانا چاہتے تھے۔ اور کبھی یہ کہ فتوحات ملکی کا انہیں بہت شوق تھا۔ حالانکہ اُن کے نزدیک صرف ایک ہی وجہ تھی اور وہ تھی اپنی قوم کی حفاظت۔ یہ تو حضرت عمر کا قول فتح ایران سے پہلے تھا اور جب ایران فتح ہو چکا اور یزدگرد کی ساری حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو اس وقت کا بھی حضرت عمر کا قول تاریخ میں محفوظ ہے آپ نے اس آخری فتح کا مژدہ سناتے ہوئے ایک پُر اثر تقریر کی اور فرمایا کہ آج مجوسیوں کی سلطنت برباد ہو گئی اور اب وہ اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ یہ الفاظ کہ **اب وہ اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔** قابل غور ہیں۔ اور یہی ان تمام لڑائیوں کی وجوہات کی اصل کنجی ہے۔ لڑائیوں کی ضرورت اسلام کو ضرر سے بچانا تھا۔ یہی ضرورت لڑائیوں کی حضرت رسول کریم صلعم کی زندگی میں تھی۔ اور یہی غرض خلافت راشدہ کے زمانہ میں بھی اسی غرض کو مدنظر رکھ کر لڑائی

شروع کی گئی۔ اور اسی غرض کو مدنظر رکھکر اسے جاری رکھا گیا۔ اور جب وہ غرض حاصل ہوگئی تو اسے ختم کردیا گیا۔ ورنہ ایران سے آگے کوئی دنیا کا خاتمہ نہ ہوگیا تھا۔ اور اس وقت تو مسلمانوں کی طاقت اس قدر ہو چکی تھی کہ دنوں میں باقی ممالک کا بھی فیصلہ کر لیتے لیکن جب اس طاقت کا خاتمہ ہوگیا جس نے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنا چاہا تھا۔ تو مسلمانوں نے جنگ کو بھی ختم کردیا۔

شکست سے ایران اور روما کی خواہش انتقام کا بڑھتے جانا

اگر یہ واقعات تاریخی محفوظ نہ بھی رہ گئے ہوتے جن سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایران نے یا روما نے اپنی آخری تباہی تک اسلام کے تباہ کرنے کے دم خم کو نہیں چھوڑا۔ تو خود فطرت انسانی کا مطالعہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچا سکتا ہے۔ اس میں تو کوئی بھی شبہ نہیں کہ ایران اور روما شروع شروع میں اپنی طاقت کے گھمنڈ پر اسلام کو نیچا دکھانا اور ملک عرب کو اپنے تصرف میں لانا چاہتے تھے۔ ایران نے بحرین کے باغیوں کی علی الاعلان مدد کی۔ اور اپنی فوج اسلامی علاقہ میں باغیان اسلام کی مدد کے لئے بھیجی۔ عراق عرب سے سجاح مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لئے اس وقت نکلی جب سارے ملک عرب میں بغاوت کی آگ پھیلی ہوئی تھی یہ ایران کے ایماء کے بغیر نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ عراق عرب میں ایران کی حکومت تھی۔ پھر جب لڑائی شروع ہوگئی اور ایران کا قدم پیچھے ہٹنے لگا۔ تو ایک اتنی طاقتور سلطنت کے لئے یہ ایک ایسی ذلت تھی کہ لازمی بات تھی کہ انتقام کا جذبہ اسکے ساتھ روز بروز بڑھتا جاتا۔ اور ابتداء میں اگر عرب کو کچلنے کا خیال کسی قدر کمزور بھی تھا تو ان شکستوں کے ساتھ اور ملک عرب کے کچھ حصص ان کی حکومت سے نکل جانے کے ساتھ ایرانی اور بھی زیادہ تند ہو جاتے بعینہ یہی نقشہ نبی کریم صلعم کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ جب نبی کریم صلعم مکہ معظمہ میں تھے تو قریش اس وقت بھی آپ کی ترقی پر حسد کرتے تھے۔ اور طرح طرح کی اذیتیں دے کر اس ترقی کو روکنا چاہتے تھے۔ جب آپ وہاں سے نکل کر مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ اور وہاں اسلام پھیلنے لگا۔ تو کینہ اور انتقام کی آگ اور بھی تیز ہوئی۔ اور اب فوج لیکر مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ جب جنگ بدر میں سخت شکست کھائی اور شکست بھی اپنے مقابل ایک نہایت

قلیل تعداد سے جنہیں وہ بہت ذلیل سمجھتے تھے۔ تو انتقام کی آگ اور بھڑکی اور پھر اس سے زبردست فوج سے حملہ آور ہوئے۔ پھر جنگ احد میں کچھ نہ بگاڑ سکے تو سارے قبیلوں کو اکسا کر پندرہ بیس ہزار کی فوج اکٹھا کر کے لائے پھر بھی ناکام ہوئے۔ بعینہ یہی حالت ایران اور شام کی لڑائیوں میں پیش آئی۔ یہ دونوں سلطنتیں عرب کے لوگوں کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ اس لئے شروع شروع میں ان کی فوج بھی مسلمانوں کے مقابلہ میں کم تعداد میں آتی تھی۔ جب شکست شروع ہوئی تو جذبہ انتقام اور تیز ہوا۔ مگر کچھ نہ بنا۔ مسلمانوں کے ساتھ خدا کی نصرت ہونے پر اُن کو کہاں یقین تھا جس قدر مار کھاتے اور پیچھے ہٹتے اسی قدر اور کینے اور انتقام کی آگ بھڑکتی اور نہ صرف مسلمانوں کو اپنے ملک سے نکالنے کے لئے بلکہ عرب اور اسلام کو برباد کرنے کے لئے اور زیادہ جوش اُن کے سینوں پیدا ہوتا۔ چنانچہ رستم جب ۱۴ھ میں قادسیہ کی لڑائی کے لئے نکلا تو ہتھیار بند ہو کر پہلے لفظ جو اس کے منہ سے نکلے یہ تھے "کل عرب کو ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا" اس سے ان کے قومی جذبات کا پتہ لگتا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ میں ایران کو دشمنوں سے صاف کردوں گا۔ بلکہ یہ کہا کہ میں عرب کو برباد کردوں گا۔ بعینہ یہی حالت قیصر روم اور اس کی عیسائی اقوام کی تھی۔ اور آگے جو واقعات تاریخی مذکور ہیں اُن سے صاف معلوم ہو گا کہ مسلمانوں نے کئی دفعہ یہ چاہا کہ لڑائی ختم ہو کر تینوں ملک اپنی اپنی حدود پر قایم رہیں۔ مگر کسریٰ اور قیصر دونوں نے بار بار اسلامی افواج پر حملہ کر کے خود انہیں لڑائی کے لئے مجبور کیا۔

> دشمن کی قوت کامل طور پر توڑنے کے بغیر جنگ کا خاتمہ نہ ہو سکتا تھا۔

اگر اسے بھی چھوڑ دیا جائے اور قوانین جنگ کو دیکھا جائے تو بھی مسلمان حق بجانب تھے۔ اگر ایک قوم لڑائی میں پہل کرتی ہے اور دوسری قوم پر حملہ کرتی ہے تو اس دوسری قوم کا فرض صرف اس قدر نہیں ہوتا کہ اس حملہ کا جواب دیکر خاموش ہو رہے بلکہ پھر جنگ کو اس وقت تک جاری رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جب دونوں میں سے ایک شکست مان لے۔ اب ایرانیوں نے ابتدا کی مسلمانوں کے ملک میں اپنی افواج کو اتارا اور بڑھایا۔ اور سلطنت اسلامی کو تباہ کرنا چاہا۔ اسی طرح شمال میں قیصر روم نے عرب کی عیسائی اقوام کو اٹھا کر

مسلمانوں کی حکومت کو تباہ کرنا چاہا۔ پس جب جنگ چھڑ گئی اور فوجیں میدان میں اتر آئیں تو کوئی قوانین جنگ ایسے نہیں کہ پہلے معرکہ کے ساتھ یا دشمن کو اپنی حدود سے باہر نکال دینے کے ساتھ جنگ کے خاتمہ کو ضروری قرار دیتے ہوں۔ اگر مسلمان یہ غلطی کرتے کہ دشمن کو اپنی سرحد سے نکال کر خاموش ہو جاتے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کل کو وہ دشمن پھر اپنی قوت کو مجتمع کر کے حکومت اسلامی کا فیصلہ کر دیتا۔ جنگ شروع ہو گئی اور شروع کرنے والے مسلمان نہ تھے۔ اب یہ جنگ ختم نہیں ہو سکتی جب تک کہ دونوں فریق میں سے ایک ہار نہ مان لے۔ یا دوسرا فریق اس کی قوت کو کامل طور پر توڑ نہ دے آخر اسی پچھلی جنگ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کو برلن تک پہنچنے کی خواہش کیوں تھی۔ اور پھر کیوں جب تک کہ اپنے حسب منشا شرائط صلح نہیں منوالیں۔ جنگ کو ختم نہیں کیا۔ فرانس اور بلجیم سے جرمنوں کو نکال دینا کیوں کافی نہ ہوا؟ اگر مسلمانوں نے انہی قوانین جنگ پر عمل کیا۔ جن پہ آج بھی مہذب اقوام کرتی ہیں۔ تو کیا برا کیا؟ ایران اور روما نے پہل کی اب جب تک ان کی قوت کو توڑ نہ دیا جاتا مسلمان اگر خاموش ہو جاتے تو اپنی قوم کے ساتھ غداری کا ارتکاب کرتے۔ اس لئے حضرت عمرؓ کو ان لڑائیوں کو جاری رکھنا پڑا یہاں تک کہ ایران اور شام ہر دو کی قوت کو پورے طور پر توڑ دیا گیا۔

اب اس سوال کا حل کرنا کچھ مشکل نظر نہیں آتا کہ عراق اور شام کی لڑائیوں میں جو سفراء مسلمانوں کی طرف سے جاتے ہیں ان کی طرف تین باتوں کا پیش کرنا منسوب کیا جاتا ہے۔ اسلام یا جزیہ یا تلوار اس مختصر پیغام میں بعد کے زمانہ کی جب اسلام کی حکومت چاروں طرف پھیل چکی تھی رنگ آمیزی ضرور نظر آتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس رنگ میں یہ پیغام دیا جاتا تھا اس کے الٹ معنی اس سے اخذ کئے جاتے ہیں

اسلام یا جزیہ یا تلوار۔

ایک بات جو یقینی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نہ کبھی تلوار کے ساتھ پیش کیا گیا۔ اور نہ تلوار کے ساتھ منوایا گیا۔ اور میور جیسے مورخ کا اعتراف ابھی نقل کیا جا چکا ہے کم سے کم ۱۶ھ تک جب عراق عرب اور شام فتح ہو چکے تھے یہ خیال مسلمانوں کے دلوں میں پیدا نہ ہوا تھا۔ کہ وہ تلوار کے ساتھ اپنے دین کو پیش کریں۔ حالانکہ اس سے

پیشتر کسریٰ یا قیصر کے پاس جس قدر سفیروں کے جانے کا ذکر ہے ان سب کی طرف یہی الفاظ منسوب کئے گئے ہیں۔ اسلام یا جزیہ یا تلوار۔ اور پھر عجیب تر بات یہ ہے کہ ان لڑائیوں میں صرف مسلمان لڑنے والے نہیں بلکہ ایران کے ساتھ لڑائیوں میں اسلامی افواج کے دوش بدوش عیسائی افواج بھی لڑتی پائی جاتی ہیں۔ اگر مسلمان دین اسلام کو بجبر منوانا ان لڑائیوں کی اصل غرض سمجھتے تھے۔ تو یہ ناممکن تھا کہ وہ عیسائیوں کو ساتھ شامل کرتے یا یہ کہ عیسائی اُن کے ساتھ شامل ہو کر لڑتے اور پھر اُس سے بھی عجیب یہ واقعہ ہے کہ ایسی بھی غیر مسلم اقوام ہیں جن کے ساتھ مسلمانوں نے اس شرط پر صلح کی کہ نہ وہ مسلمان ہوئے نہ جزیہ دیا۔ بلکہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر حفاظت ملک کا وعدہ کیا۔ چنانچہ فتوحات شام میں جب انطاکیہ وغیرہ فتح ہو چکا اور سب لوگ جزیہ دینا منظور کرتے گئے تو اہل جرجومہ نے جزیہ دینے سے انکار کیا۔ اور کہا کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ مل کر ملک کے دشمنوں سے لڑائی کریں گے۔ اور ان کے ساتھ اس شرط پر صلح کی گئی یعنی نہ وہ مسلمان ہوئے نہ جزیہ دیا۔ فتوحات ایران میں بھی دو جگہ ایسا ہی معاہدہ ہوا۔ ایک جرجان کے رئیس سے اور ایک باب کے رئیس سے ان دونوں مقامات پر بھی جزیہ کی بجائے فوجی امداد قبول کی گئی۔ ان تینوں مثالوں کے ساتھ ایک چوتھا واقعہ بنی تغلب کا یاد رکھنے کے قابل ہے۔ جن سے باوجود اُن کے عیسائی مذہب پر ہونے کے اسی طرح زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی جس طرح مسلمانوں سے وصول کی جاتی تھی۔ یہ وہ واقعات ہیں جو تاریخ میں مذکور ہیں۔ اور شاید بہت سی ایسی اور باتیں بھی اس وقت پیش آئی ہوں جنہیں تاریخ نے محفوظ نہیں رکھا۔ اب ایک طرف عیسائیوں کا اسلامی فوج کیساتھ ملکر لڑائی کرنا صاف بتاتا ہے کہ لڑائی صرف حفاظت ملکی کے لئے تھی دوسری طرف عیسائی اور مجوسی دونوں قوموں کا کوئی حصہ ایسا بھی ہے جن کے سامنے اسلام یا جزیہ یا تلوار تینوں پیش نہیں کئے گئے اور جن کے ساتھ صلح کی گئی گو نہ انہوں نے اسلام قبول کیا نہ جزیہ دیا۔ یہ واقعات تاریخی ہیں اور دوست و دشمن کو ان کا اعتراف ہے۔ اور یہ "اسلام یا جزیہ یا تلوار" کی کہانی کو اسی طرح بے بنیاد ثابت کرتے ہیں۔ جس طرح آنحضرت صلعم کے زمانے میں کفار کے ساتھ صلح کے

واقعات "اسلام یا تلوار" کی کہانی کو باطل ٹھیرا تے ہیں۔

ان واقعات سے یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا پیغام اس طرح اور ان الفاظ میں نہ تھا جس طرح عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہؤا ہے۔ اس

مسلمانوں کے پیغام کا اصل مفہوم

پیغام کے سمجھنے میں قدرے مسلمان مورخین کو بھی غلطی لگی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہی نہیں قرین قیاس ہے کہ جب ایران اور روما کی طرف سے پہل ہو کر لڑائی شروع ہو چکی تو مسلمانوں نے ایران اور روما سے یہ بھی کہا کہ اگر تم اسلام قبول کر لو تو پھر ہمیں تمہاری طرف سے پورا اطمینان ہوگا۔ اور اس صورت میں بھی ہم لڑائی بند کر دیں گے۔ اور یہ اسی کے مطابق ہے جو قرآن کریم میں بھی آتا ہے۔ کہ مسلمانوں کو ان لوگوں کے ساتھ جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے جو لڑائی کرنے میں پہل کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں پر تلوار اٹھا کر انہیں نیست ونابود کرنا چاہتے ہیں[1]۔ لیکن جن لوگوں کے ساتھ جنگ کی اجازت دی جاتی ہے اگر ان میں سے کوئی شخص مسلمان ہو جائے یا کوئی قوم مسلمان ہو جائے تو اس شخص یا قوم کے ساتھ جنگ فورًا بند کر دی جائے گی[2]۔ یہ صرف ایک خاص صورت ہے جہاں اسلام ایک رحمت کا پیغام بن جاتا ہے۔ مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ اس قوم کے ساتھ لڑائی کریں جو انہیں تباہ کرنا چاہتی ہے۔ اب اگر کوئی اور قوم ایسی قوم کے ساتھ جنگ کرے جو اسے تباہ کرنا چاہتی ہے تو وہ جنگ کو کبھی ختم نہ کرے گی جب تک کہ اپنے تباہ کرنے والوں کو تباہ نہ کرے۔ لیکن اسلام کو اللہ تعالیٰ نے اس معنی میں بھی رحمت کا پیغام بنایا ہے کہ اس کے ساتھ شخصی کینے ہی نہیں قومی کینے بھی مٹ جاتے ہیں گو ایک شخص یا قوم نے مسلمانوں پر کتنی بھی زیادتی کی ہو۔ اور مسلمان اس زیادتی کا بدلہ لینے میں حق بجانب بھی ہوں تاہم اگر وہ شخص یا قوم اسلام قبول کرے تو مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ اب اس کی پہلی زیادتی سے درگذر کریں اور اس کا بدلہ لینے کا خیال چھوڑ دیں۔ کوئی دوسری قوم یہ نہ کرے گی۔

---

[1] وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا (البقرۃ ۲-۱۹۰) اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا (الحج ۲۲-۳۹)

[2] فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین (التوبۃ ۹-۱۱)

یہی وجہ ہے کہ آیت قرآنی میں جہاں اسلام لانے کا ذکر ہے وہاں "اخوانکم فی الدین" کے لفظ بڑھائے ہیں یعنی اسلام میں یہ خاصیت ہے کہ وہ بھائی بھائی بنا کر قومی اور شخصی کینوں کو مٹا دیتا ہے۔ پھر انسان انسان کا دشمن نہیں رہتا۔ بلکہ اس کا بھائی بن جاتا ہے۔ اور لڑائی کی اصل غرض جو ایک کینہ اور تباہی کے خیال کو مٹانا تھا اسلام لانے سے پوری ہو جاتی ہے۔ پس اسی کے مطابق حضرت ابوبکر یا حضرت عمر نے اگر یہ حکم دیا ہو کہ پہلے ان دشمنوں کے سامنے جو ہمیں تباہ کرنا چاہتے ہیں اسلام پیش کرو تو یہ بالکل صحیح حکم ہے ایک دشمن قوم کو اسلام کی اصل تعلیم معلوم نہیں اور وہ خواہ مخواہ مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھ کر انہیں نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں یہ بتا دینا کہ اسلام یہ نہیں جو تم سمجھے ہو بلکہ یہ ہے۔ مسلمانوں کا اخلاقی فرض بھی تھا۔ اس لئے وہ اسلام بھی پیش کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ مفصل اسلام کے اصول کو بیان کرتے تھے کہ کس طرح ہم ایک گمراہ مردہ قوم تھے۔ کس طرح ایک پیغمبر نے اٹھ کر ہم میں زندگی پیدا کی اور ہم کو ایک نور عطا فرمایا۔ تم بھی اگر اس پیغام کو قبول کرو تو تمہاری زیادتیاں سب معاف اور ہم تم بھائی بھائی ہو کر رہیں گے۔ تمہارے کینوں کو جو بالآخر تمہاری طاقت ٹوٹ کر ہی نکل سکتے ہیں اسلام فوراً دور کر دے گا۔ اور اگر یہ منظور نہیں تو پھر جزیہ دو یعنی ہمارے باجگذار بنو۔ یہ مطالبہ بھی ناجائز نہیں۔ جیسا کہ میں دکھا چکا ہوں۔ جنگ جب شروع ہو جائے اور اس کی وجہ ایک قوم کی زیادتی ہو جو دوسری کو برباد کرنا چاہتی ہے تو وہ لڑائی ختم نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس قوم کی قوت کو نہ توڑ دیا جائے۔ پس اس کے مطابق مسلمانوں کا یہ مطالبہ تھا مطلب یہ تھا کہ تمہاری طرف سے اب ہم مطمئن نہیں ہو سکتے جب تک تم شکست مان کر خراج ادا نہ کرو۔ اور آخری صورت یہ تھی کہ اگر ویسے نہیں مانتے تو پھر آخری فیصلہ تم میں اور ہم میں تلوار کرے گی اور ہم چونکہ حق پر ہیں اس لئے تمہاری کثرت اور تمہاری قوت اور تمہارے سامان کچھ کام نہ دیں گے۔ اور وہ ظالم قوم جس نے حق کو تباہ کرنے کے لئے تلوار اٹھائی ہے تلوار سے ہی تباہ کی جائیگی۔ یہ "اسلام یا جزیہ یا تلوار" کی اصل حقیقت ہے جس سے کچھ کا کچھ مطلب نکالا جاتا ہے۔

سنہ ۱۳ھ سنہ ۶۳۴ء اس مختصر تمہید کے بعد جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے کیوں ایران اور شام

ایران کی تیاریاں

کی جنگ کو جاری رکھنا ضروری سمجھا۔ اب ہم ان واقعات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ان لڑائیوں میں مسلمانوں کو پیش آئے۔ انکے بیان کرنے میں نہایت اختصار سے کام لیا جائیگا۔

سب سے پہلے ہم سرحد ایران کے واقعات کو لیتے ہیں۔ سرحد ایران پر مقام حیرہ میں خالد مثنیٰ کو چھوڑ کر حضرت ابوبکرؓ کے حکم کے ماتحت شام کی فوج سے جا ملے تھے۔ ابھی عراق عرب ایران کے قبضہ میں تھا۔ خالد نے مثنیٰ کے ساتھ مل کر صرف اس علاقہ کو صاف کیا تھا جو دریائے فرات کے مغرب کی طرف ملک عرب کا حصہ تھا اور فرات درمیان میں ایسی حد فاصل پڑی ہوئی تھی کہ اگر ایرانی مسلمانوں کے ساتھ مزید چھیڑ چھاڑ نہ کرتے تو دونوں ملک امن کے ساتھ اپنی اپنی جگہ رہ سکتے تھے لیکن حکومت ایران کے دماغ میں باوجود خانگی تنازعات کے ایک ہی خیال سمایا ہوا تھا۔ اور وہ عرب کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا خیال تھا۔ خالد کے چلا جانے کے بعد ہرمز کو دس ہزار فوج دے کر مثنیٰ پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ مثنیٰ کی فوج اس کے مقابل میں تھوڑی تھی۔ مگر مسلمانوں کی ہمت کے سامنے کوئی بات انوکھی نہ تھی۔ اس بات کا انتظار کرنے کی بجائے کہ ہرمز اُن پر حملہ آور ہو مسلمانوں نے دریائے فرات کو عبور کر کے اس فوج کا مقابلہ کیا۔ اور اسے بھگا دیا۔ اور پھر اپنی اصل جگہ پر یعنی دریائے فرات کے مغرب کی طرف آ گئے۔

ابوعبیدہ کا لشکر

چونکہ ہر شکست حکومت ایران کی خواہش انتقام کو اور بھڑکاتی تھی اور سلطنت کی عظمت و وسعت کی وجہ سے اُس کے ذرائع غیر محدود تھے۔ اس لئے مثنیٰ کو فکر ہوئی کہ اگر خانگی تنازعات سے فارغ ہو کر حکومت ایران نے ادھر توجہ کی تو اس کی مٹھی بھر فوج مقابلہ نہ کر سکے گی۔ اس لئے انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو لکھا کہ مزید فوج کے بغیر یہ سرحد محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اور اس کی صورت صرف یہی ہے کہ جن لوگوں نے بغاوت میں حصہ لیا تھا اُن پر سے روک دور کر دی جائے اور ان کو بھی فوج میں بھرتی کر لیا جائے اس کے جواب میں دیر ہوئی تو حالت کو نازک دیکھ کر مثنیٰ خود مدینہ پہنچے مگر اس وقت حضرت ابوبکرؓ بستر مرگ پر تھے انہوں نے حضرت عمرؓ کو بلایا اور فرمایا کہ میری بیماری یا موت دونوں کی فکر کو چھوڑ کر سرحد ایران کی فکر کرو۔ اور فوج کا فوراً انتظام کرو۔ حضرت ابوبکرؓ اسی دن فوت

ہو گئے اور اگلے ہی دن حضرت عمرؓ نے اجتماع افواج کے لئے اعلان کیا مگر لوگوں پر ایران کا اس قدر رعب تھا کہ پہلے پہلے اس آواز پر خاموشی کی سی حالت رہی۔ آخر حضرت عمرؓ نے ایک پرجوش تقریر کی اور مثنیٰ نے بھی لوگوں کو بتایا کہ ایرانی ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے چونکہ بیعت خلافت کے لئے اطراف سے بھی خاصہ اجتماع ہو گیا تھا اس لئے فوراً ایک فوج تیار ہو گئی۔ جس کا سپہ سالار ابو عبید کو مقرر کیا گیا۔ گو انہیں شرف صحبت نبوی حاصل تھا

ایرانیوں کا مقبوضات اسلامی میں بغاوت پھیلانا اور نمارق پر شکست کھانا

ادھر ایرانیوں نے اپنے خانگی تنازعات کو ختم کر کے رستم کو مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے تیار کیا۔ جس نے سب سے پہلے مسلمانوں کے مقبوضہ علاقہ میں آدمی بھیج کر بغاوت پھیلا دی اور تمام مقبوضات مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے خود مثنیٰ حیرہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ آئے ادھر رستم کی فوج کا ایک حصہ فرات کو عبور کر کے حیرہ کی طرف بڑھ چکا تھا۔ اور مقام نمارق پر مقابلہ ہو کر ایرانی افواج نے شکست کھائی۔ رستم کی فوج کا دوسرا حصہ ابھی فرات کے اس پار تھا۔ اس لئے ابو عبید نے بڑھ کر اور دریا کو عبور کر کے اس حصہ کو بھی شکست دی اور حیرہ پر پھر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

واقعہ جسر

رستم اس شکست کی خبر سن کر بہت جوش میں آیا۔ اور بہمن کے ماتحت ایک نئی فوج روانہ کی۔ مسلمانوں کی فوج پچھلی جنگ کے بعد پھر دریائے فرات کے مغرب کی طرف ہٹ آئی تھی۔ بابل کے قریب آ کر ایرانی فوج دوسرے کنارہ پر خیمہ زن ہوئی اور بہمن نے ابو عبید کو کہلا بھیجا کہ یا تم دریا عبور کر کے آؤ یا ہم آتے ہیں۔ ابو عبید کے ماتحت سرداروں کا یہ مشورہ تھا کہ دشمن کو دریا عبور کرنے دیا جائے مگر ابو عبید ایرانیوں کے اس طعنہ کو برداشت نہ کر سکا کہ عرب مرد میدان نہیں ہیں۔ اور پار اترنے کا فیصلہ کیا۔ پار کا میدان تنگ تھا اور ایران کی فوج میں بہت سے ہاتھی تھے جن سے عرب گھوڑے ڈر گئے سواروں نے گھوڑوں سے اتر کر ہاتھیوں کا فیصلہ کرنا چاہا مگر خود ابو عبید اس کوشش میں ایک ہاتھی کے نیچے روندے گئے اور ہاتھیوں کا سیلاب نہ رک سکا اسلامی فوج گھبرا کر پیچھے ہٹی پیچھے دریا تھا۔ کسی شخص نے یہ خیال کر کے کہ پل کے نہ ہونے سے فوج رک کر پھر آگے

بڑھے گی پل توڑ دیا جس سے ابتری اور بڑھ گئی۔ اور لوگ دریا میں کودنے لگے مثنیٰ نے جب یہ نقشہ دیکھا تو پل کو دوبارہ بندھوایا۔ اور خود دشمن کے مقابلہ پر جم کر فوج کو پل پر سے گذارا۔ مگر نو ہزار فوج میں سے صرف تین ہزار مثنیٰ کے ساتھ رہ گئے تاہم ایرانی بھی اس قابل نہ رہے تھے کہ دریا کو عبور کر کے مسلمانوں کا تعاقب کر سکتے۔ دو ہزار کے قریب نئے بھرتی شدہ لوگ بھاگ گئے۔ لیکن اپنے اس فعل پر اس قدر نادم تھے کہ مدت تک اپنے گھروں میں واپس نہ گئے۔ اس زمانہ کی اسلامی تاریخ میں اس واقعہ کی دوسری مثال نہیں ملتی۔

حضرت عمرؓ کو یہ خبر پہنچی تو از سرِ نو تمام عرب میں اجتماع افواج کے لئے نقیب بھیجے

واقعہ بویب

عرب میں اس وقت سوال صرف حفاظت قومی کا تھا۔ چنانچہ اس موقعہ پر عیسائی اقوام کے سردار بھی حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی قوم کے ہزاروں آدمیوں کے ساتھ ایران کے مقابلہ کے لئے نکلے۔ اگر عرب کو اپنی حفاظت کی فکر نہ ہوتی تو عیسائی قومیں اس جوش و خروش سے کیوں اپنی خدمات خود پیش کرتیں۔ حضرت عمرؓ نے جریر کو ایک بھاری فوج دیکر مثنیٰ کی امداد کے لئے روانہ کیا۔ واقعہ جسر کے بعد بہمن کو خبر ملی تھی کہ دارالخلافہ میں بغاوت ہوگئی ہے۔ اس وقت ایران کا دارالخلافہ مدائن تھا۔ جو دریائے دجلہ کے دونوں کناروں پر موجودہ بغداد سے کوئی پندرہ میل نیچے واقعہ تھا۔ اور میدان جنگ سے کوئی پچاس میل کے فاصلہ پر تھا۔ ایران نے اپنی حالت کو پھر سنبھالا اور مہران کے ماتحت ایک جرار فوج روانہ کی کوفہ کے قریب بویب مقام پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ مسلمان دریائے فرات کے مغربی کنارہ پر تھے اور ایرانی مشرقی کنارہ پر ایرانیوں نے دریا کو عبور کر کے مسلمانوں پر حملہ کیا۔ لیکن آخر شکست کھائی۔ مہران خود بھی ایک عیسائی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اور ایرانی ابتری کی حالت میں بھاگے۔ ادھر پل پر رستہ رکا ہوا پایا۔ پھر لوٹے اور فوج کا بیشتر حصہ تباہ ہوگیا۔

اس شکست کے بعد ایران میں پھر انتقام کی آگ بھڑکی۔ اسوقت ایک عورت تخت حکومت پر تھی اسے تخت سے اتار کر یزدگرد جو سولہ سال کا تھا تخت نشین کیا گیا۔ آپس کے سب عناد دور کئے گئے۔ اور

حضرت سعد بن ابی وقاص کا لشکر اور شاہ ایران کے پاس مسلمان سفراء کا جانا

۱۴ھ
۶۳۵ء

اندرونی ریشہ دوانیوں سے پھر مسلمانوں کے مقبوضہ علاقہ میں بغاوت پھیلائی گئی۔ اور ایک دفعہ پھر سب مفتوحہ مقامات مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ مثنیٰ خود دور تک عرب کی پہلی سرحد کیطرف ہٹ آئے۔ ادھر عرب میں پھر حضرت عمرؓ کی طرف سے اعلان جہاد ہوا۔ اور حضرت عمرؓ نے خود سپہ سالار بنکر میدان جنگ میں جانا چاہا۔ مگر اکابر صحابہ نے مشورہ دیا کہ یہ مناسب نہیں۔ آخر سعد بن ابی وقاص پر نظر پڑی اور انہیں ایک جرار فوج کے ساتھ روانہ کیا گیا۔ اور ہر قسم کی ہدایات مفصل دی گئیں۔ کوفہ سے تین منزل کے فاصلہ پر سعد نے ڈیرہ ڈالا اور حضرت عمرؓ کو مفصل حالات لکھے۔ مثنیٰ سعد کے پہنچنے سے پیشتر ان زخموں کی وجہ سے جو معرکہ جسر میں کھائے تھے فوت ہو چکے تھے۔ ان کے بھائی نے سعد سے ان کی ہدایات وغیرہ سب بیان کیں۔ فوج کا شمار کیا گیا تو تیس ہزار تھی۔ حضرت عمرؓ کی طرف سے ہدایت پہنچی کہ قادسیہ میں مقام کرو اور پہاڑ کو پیچھے رکھکر فوج کی ترتیب کرو۔ نیز حکم ہوا کہ پہلے سفیر بھیج کر اسلام کی طرف رغبت دلاؤ۔ قادسیہ مدائن دار الخلافہ ایران سے چالیس میل کے قریب تھا۔ مسلمان سفیر گھوڑے دوڑاتے پہنچے۔ مگر وہاں کون سنتا تھا یزدگرد نے کہا کہ تم ایک ذلیل قوم ہو۔ مسلمانوں نے کہا کہ بیشک ہم ایسے ہی تھے اور ہماری کوئی حیثیت نہ تھی لیکن ایک پیغمبر ہم میں اٹھا اور اس نے ہر قسم کی ذلت کی باتوں کو ہم سے دور کر کے ہمیں نیکی کے رستہ پر لگا دیا اگر تمہیں بھی یہ مذہب پسند آئے تو تم ہمارے بھائی ہو لیکن اگر نہیں تو بدون خراج کے اب ہم تم سے صلح نہیں کر سکتے اس کو سن کر یزدگرد آپے سے باہر ہو گیا اور سفراء کو نہایت درشتی سے نکال دیا۔ یہاں تک کہ اُن میں سے ایک کے سر پر مٹی کی ایک ٹوکری اٹھوائی اور بتایا کہ تم ایسے ذلیل ہو کہ ہم تم سے ٹوکری اٹھانے کا کام لیں گے مسلمانوں نے اس سے بھی نیک فال لی کہ دشمن نے اپنی زمین خود ہمارے حوالہ کر دی اور مٹی اٹھائے ہوئے واپس آ گئے۔ کیا عجیب ایمان اُن مسلمان سپاہیوں کا تھا۔

حکومت ایران نے بھی اس دفعہ پوری تیاری کی اور رستم کو فوج دے کر روانہ کیا

جنگ قادسیہ

ایک لاکھ بیس ہزار فوج اس کے ساتھ تھی۔ یعنی مسلمانوں سے چہار چند مگر مقابلہ سے دل چراتا تھا۔ ادھر افواج کی وجہ سے علاقہ تنگ آیا ہوا تھا۔ آخر رستم او

مقابلہ کے لئے نکلنا پڑا۔ ایک دفعہ پھر صلح کی کوشش کی سفیر نے وہی بات پیش کی جو یزدگرد کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ تو رستم آگ ہوگیا اور کہا کہ میں سارے عرب کو برباد کردوں گا۔ اگلے دن صبح ہوتے ہی نہر کو جو دونوں لشکروں کے بیچ میں حائل تھی بھر کر راستہ بنایا گیا۔ اور لشکر ایران بڑھا۔ سعد اس وقت کچھ بیمار تھے اور چل پھر نہ سکتے تھے لیکن اپنے مقام سے برابر فوج کو ہر قسم کی ہدایات دیتے رہے۔ یہ نہایت خونخوار جنگ تھی جو تین دن تک برابر جاری رہی۔ پہلے دن کی لڑائی یوم الارماث دوسرے دن کی یوم الاغواث اور تیسرے دن کی یوم العماس کے نام سے مشہور ہے۔ جنگ کے پہلے ہی دن شام سے فوج کا وہ حصہ جو اصل میں لشکر عراق کا ہی حصہ تھا پہنچ گیا تھا پہلے اور دوسرے دن دونوں طرفیں کبھی آگے بڑھتیں کبھی پیچھے ہٹتیں مگر ثابت قدم رہیں۔ مگر ایرانیوں کا نقصان بہت زیادہ تھا تیسرے دن بھی یہی حالت تھی ہاتھیوں کی صف مسلمان سواروں کو آگے نہ بڑھنے دیتی تھی۔ آخر قعقاع نے دو بڑے ہاتھیوں کا کام تمام کیا۔ تو سب ہاتھی بھاگ اُٹھے مگر لڑائی برابر جاری رہی رات آگئی۔ مگر پھر بھی لڑائی کا سلسلہ برابر جاری رہا ساری رات لڑائی ہوتی رہی صبح ہوتے ہی قعقاع نے چند بہادروں کے ساتھ رستم کی طرف رخ کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی فوج کا رخ ادھر ہوا۔ آخر اس حالت کو دیکھکر رستم بھی تخت سے کود پڑا۔ اور زخم کھا کر بھاگ رہا تھا کہ ایک مسلمان سپاہی نے پہچان کر کام تمام کردیا۔ سپہ سالار کے مارا جانے کے ساتھ ہی ایرانی افواج بھاگ اٹھیں۔ اور یوں جنگ قادسیہ کا خاتمہ ہوگیا۔ اور بے شمار مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ تینوں دنوں کی لڑائی میں مسلمانوں کے ساڑھے آٹھ ہزار آدمی کام آئے۔ مگر ایرانیوں کا نقصان بہت زیادہ ہوا۔ یہ واقعہ رمضان ۱۵ھ ہجری مطابق اکتوبر ۶۳۵ء عیسوی کا ہے۔

مدائن کی طرف پیشقدمی ۱۶ھ / ۶۳۶ء

عراق عرب کی لڑائیوں میں قادسیہ کی لڑائی فیصلہ کن تھی اس نے ایرانیوں کی قوت کو بکلی توڑ دیا۔ شکست خوردہ فوج نے بھاگ کر بابل میں پناہ لی۔ سعد نے کچھ مدت یہاں قیام کرکے آخر بابل کا رخ کیا۔ اور مسلمان حیرہ میں داخل

Mubarak Masud
Mukhtar Mahmud
Qureshi.

حضرت

ہوتے ہوئے آگے بڑھے۔ اور بابل سے دشمن کو نکال کر سارے علاقہ پر قابض ہو گئے۔
ایرانیوں نے دجلہ کے مغربی کنارہ پر جا کر آخری پناہ لی۔ یعنی دار الخلافہ کے مغربی حصہ میں جو بہرہ شیر کہلاتا تھا اصل دار الخلافہ شرقی حصہ میں تھا۔ جہاں خود یزدگرد رہتا تھا۔ سعد چند ماہ بعد ۱۵ھ میں حضرت عمرؓ سے اجازت حاصل کر کے اس مقام کی طرف بڑھے راستہ میں کئی موقعہ پر ایرانی افواج سے مقابلہ ہوا۔ مدائن سے کچھ فاصلہ پر کسریٰ کی ماں خود مقابلہ کے لئے فوج لے کر آئی مگر شکست کھا کر واپس ہوئی۔ جب کسریٰ کے محل سامنے نظر آئے تو سعد پکار اُٹھے۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ آج رسول اللہ صلعم کی پیشگوئی پوری ہوئی یہ اسی پیشگوئی کی طرف اشارہ تھا جو غزوہ احزاب میں خندق کھودتے وقت نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ مجھے کسریٰ کے محل دکھائے گئے ہیں۔ اور جبرئیل نے مجھے خبر دی ہے کہ میری امت ان پر غالب ہوگی۔ آخر سعد نے مدائن کے مغربی حصہ بہرہ شیر کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ کئی ماہ تک رہا۔ مگر آخر تنگ آکر ایرانیوں کو اپنے دار الخلافہ کا مغربی حصہ چھوڑنا پڑا اور مسلمان اس پر قابض ہو گئے اور ایرانی دریائے دجلہ کے مشرقی کنارہ پر چلے گئے۔ دجلہ اور فرات کا درمیانی علاقہ جو اصل عراق عرب ہے۔ اس طرح کل مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔

سنہ ہجری ۱۶ھ

فتح مدائن۔ اب دریائے دجلہ کے مغربی کنارہ پر اسلامی افواج تھیں اور مشرقی کنارہ پر ایرانی یہی حالت کچھ دیر تک رہی آخر سعد نے اپنی فوج کو جمع کر کے کہا کہ ہماری موجودہ حالت خطرناک ہے۔ کشتیاں ایرانیوں کے قبضہ میں ہیں وہ جب چاہیں ہم پر ناگہانی حملہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم ان تک نہیں پہنچ سکتے اس لئے جب تک دشمن کو شرقی کنارہ سے نہ نکالا جائے اسوقت تک ہماری حالت ابت غیر محفوظ ہے۔ صرف ایک ہی رستہ ہمارے لئے ہے۔ کہ ایک دفعہ ہمت کر کے دریائے دجلہ کو عبور کر لیں۔ دریائے دجلہ ایک خطرناک تیز بہنے والی ندی ہے۔ اور گہرائی بھی بہت ہے۔ اور مسلمانوں کے قبضہ میں کشتیاں کوئی نہ تھیں مگر مسلمانوں کی ہمت کے سامنے پہاڑ اور دریا کوئی روک نہ تھے۔ چھ سو سوار کا انتخاب کیا گیا جو ساٹھ ساٹھ کے دستوں میں تقسیم کئے گئے پہلے ساٹھ نے توکلاً علی اللہ گھوڑے دریا میں

ڈال دیئے۔ اور تیز رو کا مقابلہ کرتے ہوئے پار نکل گئے۔ جب یہ دستہ کنارے جا لگا تو باقی بھی یکے بعد دیگرے ان کے پیچھے چلے۔ ایرانی اس نظارہ کو دیکھ کر اس قدر خائف ہوئے کہ یہ کہتے ہوئے بھاگ گئے کہ جنّ آ گئے جنّ آ گئے۔ یزدگرد نے خزانے اور مستورات کو پہلے ہی حلوان بھیج دیا تھا۔ یہ خبر سن کر خود بھی بھاگ گیا۔ سعد صفر سنہ ۱۶ ہجری مطابق مارچ ۶۳۷ عیسوی میں مدائن میں داخل ہوئے اور قرآن کریم کی یہ آیات پڑھیں۔ کم ترکوا من جنات وعیون وزروع ومقام کریم ونعمۃ کانوا فیہا فاکھین ٭ کذلک واورثنہا قوماً آخرین۔ اللہ تعالیٰ کا نشان تھا کہ وہ قوم جسے ذلیل سمجھا جاتا تھا اور جس کو دنوں میں تباہ اور برباد کرنے کی فکر تھی۔ جن کو اپنے مزدور قرار دے کر سفیر کے سر پر مٹی کی ٹوکری اٹھوائی گئی تھی۔ اس قدر عظیم الشان سلطنت کو صرف تیس ہزار آدمیوں کے ساتھ فتح کر لیتی ہے مال غنیمت جمع ہوا تو ایک میدان زر و جواہر سے بھر گیا۔ پانچواں حصہ مع کسریٰ کے ملبوسات اور زیورات اور ایک نہایت ہی قیمتی فرش کے جو زر و جواہر سے مرصع تھا مدینہ بھیجا گیا۔ اس سے پندرہ سال پیشتر جب آنحضرت صلعم مکہ سے بھاگ کر مدینہ آئے سراقہ نے انعام حاصل کرنے کے لئے آپ کا تعاقب کیا۔ جب قریب پہنچتا تو اس کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر جاتا آخر مخلصانہ حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا اے سراقہ میں تیرے ہاتھ میں کسریٰ کے سونے کے کنگن دیکھتا ہوں۔ اب سراقہ کو بلایا گیا اور کسریٰ کے سونے کے کنگن اس کے ہاتھ میں پہنائے گئے۔ مسلمانوں کو اگر فتح اور مال غنیمت سے خوشی تھی تو اس سے بڑھ کر اس بات کی خوشی تھی کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے دس اور پندرہ سال کی پیشگوئیوں کو جو انتہا درجہ کی بے کسی کے وقت کی گئی تھیں پورا کیا۔ اس خیال سے ان کے دلوں میں وہ لذت پیدا ہوئی جو دنیا کا کوئی مال اور فتح پیدا نہ کر سکتے تھے

جلولا کی لڑائی اور حلوان پر قبضہ

مدائن کا شرقی حصہ سنہ ۱۶ ہجری کے شروع میں فتح ہوا۔ یہیں سعد نے قیام کیا گرمیوں کا موسم امن سے گذر گیا۔ یزدگرد مدائن سے کوئی سو میل شمال کی طرف حلوان میں پناہ گزین تھا۔ اور مسلمانوں کی طرف سے اس پر کسی حملہ یا پیشقدمی کی تیاری نہ تھی۔ مگر حلوان میں بیٹھ کر ایرانیوں نے پھر جنگ کی تیاری شروع کی۔

اور جلولا کی طرف بڑھے۔ جو ایک بہت مضبوط مقام تھا اور اس کے گرد خندق تھی۔ ان کی پیشقدمی پر پھر سعد نے حضرت عمر سے اجازت طلب کی اور آپ کے حکم کے مطابق بارہ ہزار کا لشکر ایرانیوں کے مقابلہ کے لئے بڑھایا اور آخر جلولا میں اُن کا محاصرہ کیا۔ مگر محصورین کو حلوان سے برابر مدد پہنچتی تھی۔ مدائن سے مزید فوج بھیجی گئی اور اسی دن تک محاصرہ رہا۔ آخر ایرانیوں نے شکست کھائی۔ یزدگرد باقی فوج کو لیکر رے میں پناہ گزین ہوا۔ اور قعقاع نے بڑھ کر حلوان پر قبضہ کر لیا۔ اور وہاں فوج کا کچھ حصہ چھوڑا۔ مال غنیمت مدینہ پہنچا تو حضرت عمر رو پڑے لوگوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ مجھے خوف ہے کہ یہ دولت اور آسایش آخر میری قوم کی تباہی کا موجب نہ ہو۔ جب زیاد نے جو مال غنیمت کے ساتھ آیا تھا خراسان کی طرف پیش قدمی کی اجازت چاہی تو حضرت عمر نے روک دیا۔ اور فرمایا کہ میں تو چاہتا ہوں کہ عراق عرب اور ان ممالک کے درمیان ایسے پہاڑ حائل ہوں کہ نہ ایرانی ہم تک پہنچ سکیں اور نہ ہم ان تک۔

سردست ایران کی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہا لیکن دجلہ کے اوپر شمال کی طرف

فتح موصل تکریت پر جو مدائن سے کوئی سو میل اوپر تھا رومی افواج کا اجتماع تھا۔ اور ان کے ساتھ عیسائی بدوی اقوام مل گئیں۔ اس خطرہ کی وجہ سے اسلامی افواج اوپر بڑھیں۔ تکریت پر مقابلہ ہوا۔ عیسائی اقوام کو مسلمانوں نے پیغام بھیجا۔ اور ان کو اسلام کی طرف توجہ دلائی یہ ایاد۔ تغلب اور نمر کے کچھ قبیلے تھے۔ انہوں نے اسلام قبول کیا اور مسلمانوں کے معاون ہو گئے۔ رومی افواج نے بری طرح شکست کھائی اور مسلمانوں نے اور آگے بڑھ کر موصل پر قبضہ کر لیا۔ تکریت اور موصل جزیرہ کے حصے تھے جو عراق عرب کے شمال میں ہے اور ان پر پیشقدمی کی وجہ صرف وہاں رومی افواج کا اجتماع تھا۔ یوں جزیرہ پر مسلمانوں نے اس وقت تک چڑھائی نہیں کی جب تک کہ جزیرہ والوں نے قیصر کی افواج کو بلا کر مسلمانوں پر پہلے حملہ نہیں کیا۔ اس کا ذکر آگے شام کی لڑائیوں میں آتا ہے۔

جب سعد عراق کے شمالی حصہ میں لڑائیاں کر رہے تھے تو حضرت عمرؓ کو جنوبی حصہ

بصرہ اور کوفہ کی آبادی کے استحکام کی بھی فکر تھی۔ چنانچہ آپ کے حکم کے ماتحت عتبہ

نے بحرین سے فوج ساتھ لیکر ابلہ پر جو بندرگاہ ہے ۱۴ھ ہجری میں قبضہ کرلیا تھا اسی مقام کے قریب بعد میں شہر بصرہ آباد ہوا۔ بصرہ کی بنیاد ۱۷ھ میں رکھی گئی۔ عراق کے شمال میں حیرہ کے قریب کوفہ آباد ہوا۔ یہ دونوں شہر حضرت عمرؓ کے وقت میں آباد ہوئے اور عرب آبادیوں کے مرکز بن گئے۔

۱۴ھ
۶۳۵ء

فتح دمشق

اب ہم شام کے واقعات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اجنادین پر جنگ ہو کر قیصر کی دو اڑھائی لاکھ فوج شکست کھا چکی تھی گو اس کی خبر مدینہ میں اس وقت پہنچی جب حضرت ابوبکر حالت نزع میں تھے اس شکست کے بعد ہرقل انطاکیہ میں چلا گیا اور خالد نے محرم ۱۴ھ میں دمشق کا محاصرہ کرلیا۔ دمشق قدیم سے شام کا دار الخلافہ چلا آتا تھا اور یہ ایک نہایت سرسبز میدان میں واقع ہے۔ جو دنیا کی جنت کہلاتا ہے۔ تجارت کے لحاظ سے بھی یہ ایک مرکز ہے۔ اسکی اہمیت کے لحاظ سے خالد نے بڑے اہتمام سے اس کا محاصرہ کیا۔ چھ ماہ تک محاصرہ رہا ہرقل نے حمص سے کچھ امدادی فوج محاصرین کی مدد کے لئے بھیجی مگر خالد نے اپنی فوج کے ایک حصہ کو آگے بھیج کر اس کا دمشق کا راستہ بند کردیا۔ دمشق کی سخت سردی کو بھی مسلمانوں نے برداشت کیا۔ مگر محاصرہ کو نہ چھوڑا۔ اتفاق سے ایک رات ایک خاص خوشی کی تقریب پر اہل دمشق شراب پی کر بدمست اور غافل پڑے تھے۔ خالد ایسے موقعہ کی تاک میں تھے فوراً کچھ بہادروں کو ساتھ لیکر فصیل پر چڑھ گئے اور دروازہ کے پہرہ داروں کا خاتمہ کرکے فوج کے لئے دروازہ کھول دیا ادھر کی خبر سن کر دوسری طرف سے محصورین نے خود ابوعبیدہ کے لئے دروازے کھول دیئے۔ جو دوسرے حصہ فوج پر شہر کی دوسری طرف متعین تھے۔ اس وجہ پر کل شہر کو امن دیا گیا۔ اور نہ مال غنیمت لیا گیا نہ کسی سپاہی کو قید کیا گیا۔ دمشق کی فتح رجب ۱۴ھ مطابق ۶۳۵ء میں ہوئی۔

معرکہ فحل

ہم دیکھ چکے ہیں کہ دمشق کے محاصرین کی امداد کیلئے ہرقل نے کچھ فوج بھیجی تھی جس کے دمشق تک پہنچنے کا رستہ خالد نے بند کرکے اس فوج کو روک دیا تھا۔ اس فوج کے ساتھ کچھ اور فوج ملا کر اب ہرقل نے ضلع اردن میں فوجوں کو جمع کیا۔ اس لئے خالد

اردن کی طرف بڑھے اور مقام فحل پر ڈیرہ ڈالا۔ عیسائیوں نے اب مسلمانوں کی ہمت اور استقلال کو دیکھکر صلح کی خواہش ظاہر کی تو خالد نے معاذ کو بھیجا۔ عیسائیوں نے اپنی فوج اور سامان کی کثرت کا ذکر کیا۔ کہ معاذ کو مرعوب کریں۔ معاذ نے کہا کہ ہمارا خدا فرماتا ہے کہ من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ۔ غرض شرائط صلح پر اتفاق نہ ہوسکا۔ مسلمانوں کا مطالبہ وہی تھا جس کا ایران کے مقابلہ میں میں ذکر کر چکا ہوں۔ گو مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاق ان کی سادہ زندگی ان کی باہم مساوات عیسائیوں کے دلوں کو کھا چکی تھیں۔ لیکن ان شرائط کو قبول نہ کیا۔ بلکہ اگلے دن جو عیسائی قاصد مسلمانوں کی طرف آیا اُس نے یہ کہا کہ ہم دو دو دینار فی سپاہی کے حساب سے دے دیں گے تم یہاں سے چلے جاؤ۔ غرض لڑائی ہوئی اور رومیوں کی پچاس ہزار فوج نے یہاں بھی شکست کھائی۔ اس فتح کے ساتھ کل علاقہ اردن پر مسلمان قابض ہوگئے اور جہاں جہاں لوگ اطاعت اختیار کرتے گئے وہاں مسلمانوں نے ان کے جان مال مکان زمین گرجے وغیرہ سب کا محفوظ رکھنا شرائط میں تسلیم کیا۔ صرف یہ شرط تھی کہ مسجدوں کی تعمیر کے لئے کسی قدر زمین لی جائے گی۔

اس کے بعد اسلامی افواج حمص کی طرف بڑھیں اور خفیف مقابلوں کے بعد یہ شہر

فتح حمص

بھی ۱۵ھ میں فتح ہوگیا۔ یہاں سے خالد اور شمال کی طرف بڑھے لیکن حضرت عمرؓ نے روک دیا۔ اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان صرف ان مقامات کو لیکر جو عرب کے حصے تھے جنگ کو ختم کرنا چاہتے تھے چنانچہ سب افواج واپس ہوکر ابوعبیدہ حمص میں مقیم ہوگئے۔ عمرو بن العاص نے اردن میں قیام کیا۔ اور خالد دمشق میں واپس آگئے۔

۱۵ھ دمشق، اردن، حمص کی فتح سے قیصر کو بہت غیرت آئی اور اب پورے جوش کے ساتھ

۶۳۶ء

جنگ یرموک

فوجوں کا اجتماع شروع کیا۔ اور سلطنت کی تمام اطراف میں احکام بھیجے کہ یہاں سے جتنے آدمی مل سکیں وہ بھیجے جائیں۔ چنانچہ بہت جلد انطاکیہ میں افواج کا عظیم الشان اجتماع ہوگیا۔ مسلمانوں کو بھی اس کی خبر ملی۔ ابوعبیدہؓ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا

حالت نہایت نازک تھی شہر والوں پر بھی بھروسہ نہ تھا آخر بالاتفاق یہی فیصلہ ہوا کہ دشمن کی بڑھتی ہوئی رو کا مقابلہ یہ چھوٹا سا لشکر نہیں کر سکتا۔ اور امداد بھی جلدی نہیں پہنچ سکتی اس لئے مفتوحہ علاقہ کو خالی کر دیا جائے۔ چنانچہ ابو عبیدہ حمص سے دمشق کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور چلتے وقت اہل حمص اور سب علاقہ سے جو جزیہ وصول کیا تھا اسے واپس کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے کہا کہ جزیہ آبادی کی حفاظت کا معاوضہ تھا۔ جب وہ ہم نہیں کر سکتے تو جزیہ رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ چنانچہ یہ سب رقم خزانہ سے اُن لوگوں کو واپس کی گئی جو ابھی دشمنان اسلام کے قبضہ میں آنے والے تھے اور مذہب کے عیسائی اور یہودی تھے۔ دنیا کی تاریخ جنگ میں شاید اس کی بھی کوئی دوسری مثال نہ مل سکے مسلمانوں کے عیسائیوں کے ساتھ حسن سلوک کا یہ حال تھا کہ ان کی واپسی پر کیا عیسائی اور کیا یہودی روتے تھے اور دعائیں کرتے تھے کہ خدا ان لوگوں کو واپس لائے۔ حمص سے واپسی کا اثر دوسرے مقبوضہ مقامات پر بھی برا پڑا۔ اردن کے بھی بعض مقامات کو خالی کرنا پڑا۔ اور یرموک کے مقام پر عمرو بن العاص اور ابو عبیدہ کی افواج مل گئیں اور کچھ کمک جو مدینہ سے پہلے سے روانہ ہو چکی تھی وہ بھی پہنچ گئی۔ مگر اس سارے لشکر کو جو تیں اور چالیس ہزار کے درمیان تھا رومیوں کی دو لاکھ فوج سے کوئی نسبت نہ تھی پہلے کچھ صلح کا نامہ و پیام ہوا رومیوں نے مسلمانوں کو کچھ مال کا لالچ دیا لیکن مسلمانوں کی طرف سے یہ شرط تھی کہ جب تک شکست مان کر خراج ادا نہ کیا جائے اس وقت تک صلح نہیں ہو سکتی۔ عجیب استقلال تھا کہ تیس پینتیس ہزار کے سامنے دو لاکھ فوج پڑی ہے۔ مگر یہ یقین تھا کہ ہم حق پر ہیں اور حق غالب آئے گا۔ آخر لڑائی ہوئی یہاں تک کہ مسلمان خواتین نے بھی سپاہیوں میں شامل ہو کر لڑائی کی۔ مسلمانوں کے قدم کئی دفعہ پیچھے بھی ہٹے یہاں تک کہ ایک دفعہ خیمہ گاہ تک آ گئے جس پر عورتوں نے ملامت کی۔ مگر جان کی پروا کسی کو نہ تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک شجاعت دکھاتا اور دشمن کے لشکر کے اندر اس طرح گھس جاتا جیسے کوئی اپنے گھر کی طرف شوق سے جا رہا ہو آخر رومیوں نے شکست کھائی مسلمان تین ہزار شہید ہوئے۔ اور عیسائی بہت زیادہ تعداد میں مارے گئے ہرقل نے شکست کی خبر سنی تو قسطنطنیہ کا رخ کیا۔

جس طرح ایران کی لڑائیوں میں قادسیہ کی جنگ فیصلہ کن تھی۔ شام کی لڑائیوں میں جنگ یرموک فیصلہ کن تھی۔ اس کے بعد شام کے تمام شہر یکے بعد دیگرے اطاعت قبول کرتے چلے گئے۔ قنسرین۔ حلب۔ انطاکیہ۔ جیسے بڑے بڑے مقامات نے صلح قبول کرلی تو چھوٹے چھوٹے مقامات میں مقابلہ کی طاقت ہی نہ تھی۔ ان میں بعض لوگ مسلمان بھی ہو گئے لیکن کثیر حصہ عیسائیت پر ہی رہا۔ اور جزیہ دینا قبول کیا۔ ایک مقام جرجومہ کے رہنے والوں نے نہ اسلام قبول کیا نہ جزیہ دیا۔ بلکہ اُن سے اس شرط پر صلح کی گئی کہ لڑائی کے وقت اگر ضرورت ہوگی تو مسلمانوں کا ساتھ دیں گے یہ صلح صاف بتاتی ہے کہ مسلمان صرف ایک حالت امن پیدا کرنا چاہتے تھے اس لئے جہاں کسی قوم پر اعتبار ہوتا تھا جزیہ کی شرط بھی ترک کر دیتے تھے۔

شام پر پورا تصرف

ابتدا میں جب حضرت ابوبکر نے شام کی طرف اپنی افواج بھیجیں تو فوج کو تین چار حصوں میں تقسیم کرکے شام کی مختلف اطراف میں بھیجا تھا فلسطین کے صوبہ کی طرف عمرو بن العاص تھے لیکن قلت فوج کے باعث انہیں بار بار اسلامی لشکر کی امداد کے لئے جو دمشق کی طرف جنگ کر رہا تھا جانا پڑتا تھا۔ اس لئے بیت المقدس اب تک فتح نہ ہوا تھا۔ جنگ یرموک کے بعد جب اسلامی افواج کی اس طرف زیادہ ضرورت نہ رہی۔ تو بیت المقدس کا محاصرہ کیا گیا۔ دوسری طرف ابوعبیدہ بھی شمال کی طرف سے فارغ ہو کر ادھر متوجہ ہوئے ان کی آمد کی خبر سن کر ارطبون اپنی فوج کو لیکر مصر میں چلا گیا[1] اور شہر والوں نے بدیں شرط اطاعت قبول کی کہ حضرت عمر خود آکر شرائط صلح پر دستخط کریں۔ بیت المقدس چونکہ انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ رہا تھا اس لئے مسلمان اس مقام کو پاک سمجھ کر اسی طرح اس کی عزت کرتے تھے جس طرح وہ بنی اسرائیل کے نبیوں کی عزت کرتے تھے حضرت عمر نے صحابہ کو جمع کرکے مشورہ کیا۔ اور آخر فیصلہ یہی ہوا کہ آپ خود جائیں۔ چنانچہ حضرت عمر مدینہ سے بیت المقدس کو روانہ ہوئے اس شخص کا سفر جو اس وقت نہ صرف ملک عرب کا بادشاہ تھا۔ بلکہ عراق اور شام کو بھی فتح کر چکا تھا۔ سادگی

فتح بیت المقدس اور حضرت عمر کا سفر

[1] یہ امر فتح مصر کے واقعات میں یاد رکھنے کے قابل ہے۔

میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ وہی موٹا اور سادہ لباس پہنے ہوئے چند آدمیوں کو ساتھ لیکر آپ چلے اور معاملات خلافت کو حضرت علی کے سپرد کیا۔ جابیہ میں خالد بن ولید و دیگر افسران نے استقبال کیا۔ اُن کے لباس کی ظاہری شان کو دیکھ کر آپ ناراض ہوئے اور آپ کے لئے عمدہ لباس لایا گیا تو اس کے پہننے سے انکار کر دیا وہی اپنا سادہ لباس رکھا معاہدہ لکھا گیا۔ اس معاہدہ کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں تا کہ معلوم ہو کہ عموماً مسلمان اس وقت غیر مذاہب والوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے تھے۔

معاہدہ بیت المقدس

"یہ وہ معاہدہ امن ہے جو خدا کے بندے امیر المومنین عمر نے ایلیاء کے لوگوں سے کیا۔ یہ امن جو ان کو دیا جاتا ہے۔ ان کی جانوں اور ان کے مال اُن کے گرجاؤں اور اُن کی صلیبوں اور اُن کے بیماروں اور تندرستوں اور ان کے جملہ اہل مذہب کے لئے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ان کے گرجا گھروں میں سکونت نہ کی جائیگی نہ انہیں گرایا جائیگا نہ انہیں یا اُن کے احاطوں کو کچھ نقصان پہنچایا جائیگا۔ اور نہ ان کی صلیبوں اور ان کے اموال کو۔ نہ اُن پر اُن کے دین کے بارے میں کوئی جبر کیا جائیگا۔ اور نہ ان میں سے کسی کو تکلیف دی جائیگی۔ اور نہ اُن کے ساتھ ایلیا میں کوئی یہودی رہے گا۔ اور ایلیا والوں کیلئے یہ لازم ہے کہ وہ جزیہ دیں جیسے دوسرے شہروں والے دیتے ہیں۔ اور یونانیوں اور لٹیروں کو نکال دیں۔ پس جو کوئی ان سے نکل جائے تو اس کی جان اور مال کی حفاظت کی جائے گی یہاں تک کہ وہ امن کی جگہ پر پہنچ جائے اور جو کوئی یونانیوں میں سے ایلیا میں رہنا چاہے تو وہ امن میں ہوگا اور اسے اہل ایلیا کی طرح جزیہ دینا ہوگا۔ اور جو کوئی اہل ایلیا میں سے چاہے کہ اپنی جان اور مال کو لیکر یونانیوں کے ساتھ چلا جائے اور اپنے گرجاؤں اور صلیبوں کو چھوڑ جائے۔ تو اُنکے لئے بھی امن ہے اور ان کی جانوں اور گرجاؤں اور اُن کی صلیبوں کی حفاظت کی جائیگی یہاں تک کہ وہ اپنی امن کی جگہ پہنچ جائیں اور جو کچھ اس تحریر میں ہے اس پر اللہ کا عہد اور اس کے رسول کا اور اس کے خلفاء اور مومنین کا ذمہ ہے جب تک کہ یہ لوگ مقررہ جزیہ ادا کرتے رہیں۔"

اس تحریر پر خالد بن ولید عمرو بن العاص ۔ عبدالرحمن بن عوف معاویہ بن ابی سفیان گواہ ہیں اور ۱۵ھ ہجری میں لکھا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالد ۱۵ھ ہجری تک معزول نہیں ہوئے ۔ ورنہ ان کی جگہ ابو عبیدہ کی گواہی ہوتی عیسائی مورخین نے لکھا ہے کہ جب حضرت عمر نے بطریق کے ساتھ شہر کے مختلف مقامات اور زیارت گاہوں کو دیکھا تو اتفاق سے نماز کا وقت آگیا ۔ اور بطریق نے عرض کیا کہ آپ چاہیں تو یہیں نماز پڑھ سکتے ہیں ۔ یہ ان کا ایک خاص قدیم گرجا تھا ۔ لیکن آپ نے یہاں اور پھر قسطنطین کے گرجا میں جہاں صفیں بچھا دی گئی تھیں نماز پڑھنے سے انکار کیا ۔ اور فرمایا کہ جہاں ہم نماز پڑھیں گے مسلمان اسے اپنی مسجد بنائیں گے ۔ اس لئے گرجا میں نماز نہ پڑھی ۔ یہ وہ مثال ہے جو رسول اللہ صلعم کے صحابہ نے پیش کی ۔ اگر کسی مسلمان فاتح نے اس سے تجاوز کیا ہو تو اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں ۔

قیصر کی آخری کوشش اور جزیرہ والوں کا حملہ

۱۷ھ ہجری ۶۳۸ء

ہجری کے سترہویں سال میں قیصر نے پھر شام کو لینے کی کوشش کی اس کے اصل محرک اہل جزیرہ تھے یہ وہ حصہ ملک ہے جو عراق عرب کے شمال میں مسلمانوں نے عراق عرب کو لیکر اس کے مشرق یا شمال دونوں طرف پیشقدمی بند کر دی تھی ۔ حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ سوائے اس ضرورت کے جو عرب کی حفاظت کے لئے پیدا ہوتی تھی قدم آگے بڑھائیں ۔ شام کی فتح کے بعد بھی ایشیائے کوچک کی طرف کوئی پیشقدمی نہیں کی گئی ۔ حالانکہ اس وقت اسلام کی قوت ایسی زبردست تھی کہ جدھر افواج ظفر امواج کا رخ ہوتا کوئی مقابلہ کرنیوالا نہ تھا روپیہ اس قدر تھا کہ جس کی کوئی انتہا نہیں ۔ لیکن مسلمانوں کی غرض فتوحات ملکی نہ تھی ۔ اپنے ملک کی حفاظت تھی سو اس غرض کے پورا ہونے کے ساتھ اور دوسری طرف عرب اقوام کے عرب کے ساتھ مل جانے پر آئندہ لڑائی کو روک دیا گیا ۔ مگر عیسائی اور ایرانی باوجود شکست پر شکست کھانے کے ابھی بس نہیں کرتے تھے ۔ چنانچہ اہل جزیرہ نے قیصر کو لکھا اور اس نے اپنی افواج سمندر کے رستے اتاریں ۔ انطاکیہ نے اپنے دروازے ان کے لئے کھول دیئے ۔ قنسرین ۔ حلب اور دوسرے شمالی قصبات نے بھی کھلی بغاوت اختیار

کی ادھر سے اہل جزیرہ تیس ہزار فوج کے ساتھ بڑھے۔ ابو عبیدہ نے جو کچھ فوج میسر آ سکتی تھی اس کا حمص پر اجتماع کیا اور ساتھ ہی حضرت عمر کو ان حالات سے اطلاع دی حضرت عمر نے ہر طرف قاصد دوڑائے کہ ہر جگہ سے فوج کا کچھ حصہ فوراً امداد کو پہنچے حالات ایسے خطرناک تھے کہ آخر خود بھی مدینہ سے چل پڑے۔ ادھر آپ کے حکم کے ماتحت اسلامی فوج کا ایک حصہ جزیرہ کی طرف بڑھا اور اہل جزیرہ کو گھر کی فکر پڑ گئی۔ عرب قبائل جو عیسائیوں کی امداد کیلئے جمع ہو گئے تھے وہ بھی پچھتائے۔ اور خفیہ طور پر خالد سے اقرار کیا۔ کہ ہم واپس ہو جائیں گے۔ اس لئے قبل اس کے کہ عراق عرب کی فوج حمص پہنچے اور حضرت عمر کے بھی پہنچنے سے پیشتر عیسائی قوت کو کمزور پا کر ابو عبیدہ نے حملہ کیا اور عیسائی افواج نے سخت شکست کھائی۔

فتح جزیرہ

اہل جزیرہ کی اس زیادتی کی سزا ضروری تھی اس لئے حضرت عمر نے سعد کے نام حکم بھیجا کہ جزیرہ پر فوج کشی کی جائے۔ گو کوئی بڑی جمعیت حملہ آور نہیں ہوئی مگر جزیرہ والے چونکہ قیصر کے ساتھ مل کر شکست کھا چکے تھے۔ اب انہوں نے زیادہ مقابلہ بے سود سمجھا۔ بعض مقامات پر معمولی لڑائیاں ہوئیں اور ۱۷ھ ہجری میں جزیرہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

خالد کی معزولی

اس جگہ ایک دو اور اہم امور کا ذکر ضروری ہے جو اسی سال یعنی ۱۷ھ ہجری میں پیش آئے ان میں سے ایک خالد کی معزولی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت عمر لڑائیوں میں خالد کے طریق عمل کو پسند نہ کرتے تھے۔ ابتدائی بغاوت کو فرو کرنے میں بھی جو سلوک مالک بن نویرہ کے ساتھ انہوں نے کیا گو حضرت ابوبکر نے ان کے عذر کو قبول کر لیا تھا مگر حضرت عمر مطمئن نہ ہوئے تھے۔ لڑائیوں میں بعض وقت خالد کی طرف سے بے جا تشدد بھی ہو جاتا تھا۔ جسے حضرت عمر پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن عنان خلافت کو ہاتھ میں لے کر حضرت عمر نے حتی الوسع نرمی سے کام لیا اور خالد سے کچھ تعرض نہیں کیا۔ فتح بیت المقدس تک خالد ہی شام کی فوج کے افسر معلوم ہوتے ہیں کیونکہ انہی کے دستخط معاہدہ پر ہیں۔ اس کے بعد آپ نے خالد کے حساب کتاب دینے سے انکار کرنے پر ان کو معزول کر کے ابو عبیدہ کے ماتحت کر دیا۔ ۱۷ھ میں خالد نے ایک شاعر کو ایک ہزار دینار انعام

دیا تو حضرت عمر کو یہ ناپسند ہوا۔ اور انہوں نے باز پرس کی۔ خالد نے پہلے جواب دینے سے انکار کیا۔ تو حضرت عمر کی ہدایت کے مطابق حضرت بلال نے انہی کے عمامہ سے اُن کے ہاتھ باندھ دیئے۔ گویا ان کو مجرم قرار دیا اس کے بعد خالد نے کہا کہ میں نے یہ رقم اپنی جیب سے دی ہے۔ تو ان کی بریت کی علامت کے طور پر اُن کے ہاتھ کھول دیئے گئے۔ اتنے عظیم الشان جرنیل کے ساتھ جس کی فتوحات نے ایک دنیا کو حیران کر دیا۔ مجمع عام میں یہ سلوک بتاتا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں عزت نیکی اور تقویٰ کی تھی نہ خاص شخصیت کی! اور شخصیت کی عزت بھی جو تھی تو وہ محض اس کی نیکی اور اس کی خدمت اسلام کی وجہ سے تھی اور بڑے سے بڑے آدمی کی غلطی پر بھی اسی طرح گرفت ہوتی تھی جس طرح چھوٹے سے چھوٹے انسان کی غلطی پر۔ اسلام کی اس مساوات کا نظارہ دنیا کی تاریخ میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔

اس کے بعد خالد مدینہ آئے اور حضرت عمر کے سامنے اپنی بریت ظاہر کی حضرت عمر نے کہا میں اب بھی تم سے محبت رکھتا ہوں اور تمہاری عزت کرتا ہوں اور عمال کو لکھ بھیجا کہ میں نے خالد کو ناراضی سے یا خیانت کی وجہ پر معزول نہیں کیا۔ بلکہ میں ڈرتا ہوں کہ لوگ فتوحات اسلام کو خالد کی طرف منسوب نہ کریں بلکہ یہ سمجھ لیں کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔

۱۸ھ عراق اور شام میں ۱۷ھ کے آخر میں وبائے طاعون کا آغاز ہوا۔ اور ۱۸ھ تک

عمواس کی وبا

۶۳۹ء اس کا سلسلہ رہا حضرت عمر نے پھر ایک دفعہ شام کا سفر اختیار کیا تا کہ موقعہ پر پہنچ کر اسکے انسداد کی تدابیر سوچیں۔ ابو عبیدہ وغیرہ استقبال کے لئے آئے جب اُن سے حالات کا علم ہوا تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ رسول اللہ صلعم کی حدیث بھی آپ کے سامنے بیان کی گئی کہ آپ نے فرمایا ہے کہ جب کسی مقام پر طاعون پڑے تو اس میں داخل نہ ہونا چاہئے۔ اور نہ ہی جہاں طاعون ہو اس جگہ کے لوگوں کو بھاگ کر دوسری جگہ جانا چاہئے۔ اس لئے آپ نے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ابو عبیدہ نے کہا کہ آپ خدا کی تقدیر سے بھاگتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ ہاں خدا کی تقدیر سے خدا کی تقدیر کی طرف بھاگتا ہوں یعنی اگر ایک جگہ بیماری خدا کی تقدیر سے ہے تو دوسری جگہ محفوظ بھی خدا کی تقدیر سے ہی آپ نے ابو عبیدہ کو لکھا کہ نشیب جگہ کو چھوڑ کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر افواج کو پھیلا دیا۔

جائے۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی لیکن زہریلی ہوا سے متاثر ہو چکے تھے۔ راستہ میں ہی انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت معاذ بن جبل کا انتقال ہوگیا۔ آخر عمرو بن العاص نے فوج کو پہاڑوں پر ادھر ادھر پھیلا دیا۔ اور طاعون رک گئی لیکن پچیس ہزار مسلمان اس کا شکار ہوئے۔ حضرت عمر کا باوجود اس حدیث کے علم کے کہ جہاں طاعون ہو وہاں سے بھاگنا نہ چاہئے۔ افواج کو اس جگہ سے ہٹا کر دوسرے مقامات پر متفرق کر دینے کا حکم صاف بتاتا ہے کہ اس حدیث کا منشاء صرف اس قدر تھا کہ طاعون زدہ مقامات کے لوگ بھاگ کر دوسرے مقامات پر طاعون کو نہ پھیلائیں۔ اور طاعون زدہ مقام کو چھوڑ کر جنگل میں نکل جانا جہاں ہوا صاف ہو اور دوسروں کو ملوث کرنے کا بھی خطرہ نہ ہو منع نہیں۔ طاعون سے جو تباہی آئی اُس کے انتظام کے لئے حضرت عمر پھر شام کی طرف گئے۔ اسی سفر میں آپ راستے میں ایلہ کے مقام پر وہاں کے بشپ کے پاس ٹھیرے جس نے خود اپنے ہاتھ سے آپ کے کرتہ کی مرمت کی جو سفر میں پھٹ گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں سے اس وقت کیسے تعلقات تھے اسی سال یعنی ۱۸ھ ہجری میں ہی ملک عرب میں قحط پڑا۔ جس کے اندر حضرت عمرؓ

عرب میں قحط

نے ایک معمولی مزدور کی طرح مگر اس درد کو لے کر جو ایک عظیم الشان مصلح کے دل میں ہی پیدا ہو سکتا ہے قوم کی خدمت کی۔

۱۸ھ میں حضرت عمر کو طاعون کی بربادی کے متعلق انتظام کیلئے پھر شام کا سفر کرنا

مصر پر پیشقدمی کی وجوہات

پڑا۔ اس وقت شام کی افواج پر عمرو بن العاص تھے انہوں نے حضرت عمر سے مصر پر فوج کشی کیلئے اجازت چاہی۔ اس امر کی کوئی تفصیلات تاریخ میں موجود نہیں کہ کن واقعات کی بنا پر اجازت مانگی گئی۔ لیکن تاریخ کی خاموشی سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ مہم محض فتوحات ملکی کے لئے تھی یا جیسا کہ بعض عیسائی مورخین نے لکھ دیا ہے کہ بیکار پڑی ہوئی فوج تنگ آگئی تھی صحیح نہیں۔ ابھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ خطرناک وبا سے پچیس ہزار مسلمان شام کی فوج میں سے ہلاک ہو چکے تھے۔ اور قیصر کے حملوں کا خطرہ ابھی دور نہ ہوا تھا۔ ابھی ایک سال پیشتر ایسا حملہ ہو چکا تھا ایک طرف فوج کا وبا سے

اس قدر کمزور ہو جانا دوسری طرف ایک غیر قوم کا ملک شام میں ہونا دونوں چاہتے تھے کہ اس ملک کی حفاظت کا کافی انتظام ہو حضرت عمر نے جو ایران اور شام دونوں طرف بڑھنے کے خلاف تھے "بہت شش و پنج کے بعد" جیسا کہ سر ولیم میور نے لکھا ہے اجازت دے دی۔ اور حالت یہ تھی کہ عمرو بن العاص کے ساتھ مشکل سے چار ہزار فوج ہو سکی اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قیصر کی طرف سے مصر کے اندر سے بڑھنے کا خطرہ تھا جس کے دفعیہ کے لئے حضرت عمر کو اجازت دینی پڑی۔ اس سے پیشتر جو حملہ قیصر نے اہل جزیرہ کی مدد سے کیا تھا اور جس میں انطاکیہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا وہ سکندریہ سے ہی ہوا تھا۔ جو مصر کی مشہور بندرگاہ ہے اور قرین قیاس ہے کہ اس وقت کسی اور حملہ کی اسی راستہ سے تیاری تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس بات کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جب عمرو بن العاص پہلے ۱۵ھ میں بیت المقدس کی طرف بڑھے تھے تو ارطبون اپنی فوج کے ساتھ مصر کی طرف ہٹ گیا تھا وہ فوج ابھی وہاں موجود تھی۔ چنانچہ فسطاط کے محاصرہ میں اسی ارطبون کا ذکر بھی آتا ہے۔ یعنی جب مقوقش نے پانچ دن کے لئے ہنگامی صلح کی تو ارطبون اس کے خلاف تھا پس عمرو بن العاص کا مصر کی طرف پیشقدمی کرنے کی اجازت لینا کسی ایسی بنا پر ہی تھا۔ یعنی ایک طرف ارطبون کی فوج وہاں موجود تھی دوسری طرف مصر کے رستے قیصر پہلے حملہ کر چکا تھا۔ اور اب پھر کوئی خطرہ تھا ورنہ حضرت عمر ہرگز اجازت نہ دیتے

۱۹ و ۲۰ھ
۶۴۰ و ۶۴۱ء

غرض ۱۸ھ کے آخر میں عمرو بن العاص صرف چار ہزار فوج کے ساتھ بڑھے حضرت

مصر پر حملہ عمر نے یہ محسوس کر کے کہ فوج تھوڑی ہے پہلے انہیں واپس بلانا چاہا۔ مگر یہ معلوم کر کے کہ وہ مصر کے اندر پہنچ گئے ہیں زبیر کے ماتحت کچھ اور فوج ان کی مدد کے لئے روانہ کی عمرو بن العاص وادی العریش کے رستے ۱۰ ذوالحج ۱۸ھ مطابق ۱۲ دسمبر ۶۳۹ء سرحد مصر میں داخل ہوئے اور چند شہروں فرما بلبیس وغیرہ پر مقابلہ ہو کر آخر فسطاط پر پہنچے جہاں دریائے نیل کے کنارے پر مضبوط قلعہ تھا جس میں شاہی فوج رہتی تھی اس کا محاصرہ کیا گیا۔ سات ماہ تک یہ محاصرہ رہا۔ آخر زبیر خود اور ان کے ساتھ کچھ صحابہ سیڑھی لگا کر قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے۔ اور نعرہ تکبیر بلند کیا۔ عیسائیوں نے یہ دیکھ کر ہتھیار ڈال دیئے اور

اور سب کو امان دے دی گئی۔ یوں ۱۹ھ میں مصر کا حصہ زیرین قیصر کی سلطنت سے منقطع ہو گیا۔ اور مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔

سکندریہ کی فتح

شکست کی خبر سنکر قیصر نے سکندریہ پر مسلمانوں کے مقابلہ کیلئے اور فوجیں اتاریں ادھر عمرو بن العاص نے بھی حضرت عمرؓ سے سکندریہ پر بڑھنے کی اجازت مانگی۔ بیچ میں رومیوں اور مصریوں نے ایک جگہ مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ آخر سکندریہ کا محاصرہ ہوا مگر چونکہ سمندر کی طرف سے برابر رسد اور امداد پہنچتی تھی اس لئے محاصرہ نے بہت طول کھینچا مگر آخر سکندریہ فتح ہو گیا۔ اور سارا ملک مصر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ سکندریہ سنہ ۲۰ھ مطابق سنہ ۶۴۱ء میں فتح ہوا۔ عمرو بن العاص نے حضرت عمرؓ کے حکم کے مطابق فسطاط پر دارالخلافہ قائم کیا۔ چونکہ سکندریہ میں کوئی مضبوط فوج حفاظت کے لئے نہ چھوڑی گئی تھی۔ اس لئے قیصر نے حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں ایک زبردست بیڑا بھیج کر سکندریہ کو پھر لے لیا۔ اور عمرو بن العاص نے سنہ ۲۵ھ میں دوبارہ اسے مسخر کیا۔

کتب خانہ اسکندریہ

فتح اسکندریہ میں مشہور کتب خانہ سکندریہ کا ذکر بھی ضروری ہے۔ گبن کی تحقیقات تو اس کے متعلق صاف ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی فتح سے بہت پیشتر یہ کتب خانہ جلایا جا چکا تھا۔ یہاں میور کے الفاظ نقل کر دینا کافی ہے۔ "عربوں کے کتب خانہ اسکندریہ کو جلانے کی کہانی بعد کی ایجاد ہے!!"

نہر سویز

عمرو بن العاص کے عظیم الشان کارناموں میں سے یہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ کے حکم کے ماتحت دریائے نیل کو ایک نہر کھدوا کر بحیرہ قلزم سے ملا دیا۔ چنانچہ اسی راستہ مصر کا غلہ بحیرہ قلزم کے راستہ ینبوع کی بندرگاہ میں پہنچتا تھا۔ اسی سال تک یہ نہر کام دیتی رہی مگر اس کے بعد ریت سے بھر کر بے کار ہو گئی۔

جنوبی ایران یا خوزستان

"ایک دفعہ پھر خلافت کے مشرقی مقبوضات کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہم عمرؓ کی محتاط پالیسی کا اب بھی مسلمانوں کو عراق عرب کے اندر محدود رکھنے کا میلان پاتے ہیں۔۔۔۔ لیکن واقعات کی رو نے انہیں جلدی ہی اس

حدبندی کے توڑنے پر مجبور کردیا" سر ولیم میور کے الفاظ ہیں۔ بحرین کے حاکم علاء تھے۔ خلیج فارس کا ایک کنارہ اُن کے ہاتھ میں تھا۔ اور دوسرا کنارہ ایرانیوں کے قبضہ میں۔ دشمن کے اس قرب کی وجہ سے انہوں نے خطرہ محسوس کرکے مقابل کے حصہ ملک کو اپنے قبضہ میں کرنا چاہا۔ اور سنہ ۱۶ھ میں دوسرے ساحل پر فوج اتاری۔ لیکن خود نرغہ میں آگئے اور اپنی فوج کو واپس لانے میں ناکام ہوئے تب حضرت عمر نے عتبہ کو فوج دیکر ان کو اس مصیبت سے نکالنے کے لئے بھیجا چنانچہ عتبہ ان کو نکال لائے۔ اس سے قرب وجوار کی دشمن قوموں کا حوصلہ بڑھ گیا۔ ہرمزان ایک ایرانی حاکم صوبہ تھا۔ قادسیہ کی شکست میں یہ بھاگ کر اپنے صوبہ اہواز میں پہنچا۔ جو بصرہ سے قریب واقع ہے اس نے اب عربوں کی بیرونی چوکیوں پر حملے شروع کئے اور عتبہ نے اس پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا" (میور) یہ ۱۷ھ کا واقع ہے ایک بدوی قوم کی مدد سے وہ دشمن کو اہواز سے نکالنے میں کامیاب ہوگئے اور صلح ہوکر اہواز حکومت اسلامی کو دے دیا گیا۔ اور عتبہ نے اس علاقہ کو اس بدوی قوم کے سپرد کردیا۔ ادہر عتبہ کی وفات پر مغیرہ حاکم بصرہ مقرر ہوئے بدوی قوم اور ہرمزان میں سرحد کے متعلق جھگڑا ہوا۔ اس پر ہرمزان نے پھر صلح کو توڑ کر مسلمانوں کے خلاف لڑائی کی مگر آخر شکست کھائی اور اہواز پھر مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ اسلامی فوج نے اس فتح پر آگے بڑھنا چاہا تو حضرت عمر نے پھر روک دیا۔ ہرمزان مشرق کی طرف بھاگ گیا تھا مگر مسلمانوں نے پھر سے امن دیا یہ سنہ ۱۸ھ کا واقعہ ہے اس کے کچھ مدت بعد شکست خوردہ شاہ ایران یزدگرد نے جو اب مرو میں تھا اپنے ایلچیوں کے ذریعہ سے پھر لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ اور ہرمزان کا رویہ مشتبہ ہوگیا۔ چنانچہ سنہ ۱۹ھ میں حضرت عمر نے کوفہ اور بصرہ کی افواج کو نعمان کے ماتحت مقابلہ کا حکم بھیجا۔ ہرمزان نے ایک بڑی ایرانی فوج کے ساتھ رام ہرمز پر مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور شوستر کے قلعہ میں جو اہواز سے پچاس میل شمال کو تھا پناہ لی۔ یہاں مسلمانوں نے کئی ماہ تک محاصرہ رکھا۔ اور آخر ایک پوشیدہ رستہ سے داخل ہوکر قلعہ کو سر کیا ہرمزان نے اس شرط پر اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالہ کیا کہ اسے حضرت عمر کے پاس

پہنچا دیا جائے اور وہ جو چاہیں اس سے سلوک کریں۔

ہرمزان جب حضرت عمر کے سامنے آیا تو زرق برق شاہانہ لباس پہنے ہوئے تھا۔

ہرمزان کا قید ہونا اور اسلام لانا

درباری اور خدام ساتھ تھے۔ ادھر فاتح شہنشاہ اس وقت موٹا کرتہ پہنے ہوئے مسجد میں زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ ہرمزان پہلے سے ہی مسلمانوں کی حالت کو دیکھ چکا تھا تعلیم اسلام سے واقف تھا اور اب حضرت عمر کو اس حالت میں دیکھکر صداقت اسلام اس کے دل کو کھا گئی۔ کونسی طاقت ہے جو دنیا کی دلفریبیوں کو اس طرح انسان کے دل سے دور کردے کہ بے شمار جواہرات اور خزانوں کا مالک تین سلطنتوں کا شہنشاہ ہو کر زر و جواہر کو مٹی سے بھی کم وقعت دے ایک ہی وقت میں دنیا کا زبردست سے زبردست اور امیر سے امیر بادشاہ بھی ہو۔ اور غریب سے غریب فقیر بھی۔ دل تو کھا یا جا چکا تھا لیکن اس بات کو پسند نہ کرتا تھا۔ کہ یہ کہا جائے کہ جان بچانے کے لئے مسلمان ہو گیا ہے خاک نشین شہنشاہ کے سامنے حاضر ہوا۔ تو حضرت عمر کو اس کی بار بار کی دغا بازی کی وجہ سے سخت رنج تھا۔ آپ نے فرمایا میں ایسے شخص کی جان بخشی نہیں کرسکتا جس نے اس قدر مسلمانوں کو تہ تیغ کرایا ہے۔ عرض کیا کہ پانی کا ایک پیالہ پینے کو دیجئے۔ پیالہ ہاتھ میں لے کر متامل ہوا اور کہا کہ میں پانی نہیں پی سکتا جب تک اطمینان نہ ہو کہ مجھے اس سے پیشتر ہی قتل نہ کرایا جائے گا۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ جب تک تم یہ پیالہ نہ پی لو اس وقت تک تم امن میں ہو۔ فوراً پیالہ زمین پر پھینک دیا اور کہا آپ اپنے اقرار کے مطابق اب مجھے قتل نہیں کرسکتے۔ حضرت عمر اسکی اس چالاکی پر حیران ہوئے تب اس نے کلمہ شہادت پڑھا اور کہا کہ میں پہلے سے ہی مسلمان ہوں۔

ایران کی طرف بڑھنے کی روک اور حضرت عمر کی خدمت میں مسلمانوں کا وفد

حضرت عمر نے چونکہ سختی سے ایران کی طرف پیشقدمی کو روک دیا تھا اس لئے ایک وفد مسلمانوں کا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ اس روک کو دور کیا جائے۔ سر ولیم میور لکھتا ہے " حضرت عمر نے وفد سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ یہ ایرانی بار بار عہد کو توڑتے اور ہمارے خلاف بغاوت کرتے

ہیں شاید تم لوگ اُن پر سختی کرتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ بلکہ آپ نے ہمیں آگے بڑھنے سے روک دیا ہے اور اُن کا بادشاہ اُن کے درمیان انہیں اکسانے کے لئے موجود ہے۔ دو بادشاہ ایک وقت نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ ایک دوسرے کو نکال نہ دے یہ ہماری سختی نہیں۔ بلکہ اُن کا بادشاہ ہے جو انہیں بار بار اکساتا رہتا ہے اور یہ اسی طرح ہوتا رہے گا جب تک کہ آپ روک کو دور کر کے ہمیں آگے بڑھنے اور بادشاہ کو نکالنے کی اجازت نہ دیں۔ اس وقت تک ان کی امیدیں اور ان کے منصوبے منقطع نہیں ہو سکتے۔" میور لکھتا ہے کہ ہرمزان نے بھی اس بات کی تائید کی اور آخر حضرت عمرؓ پر اس بات کی صداقت روشن ہو گئی کہ پیشقدمی پر جو روک ڈالی گئی ہے اسے دور کر دینا ضروری ہے۔" اپنی حفاظت کے لئے اب کوئی چارہ نہ رہا تھا سوائے اس کے کہ کسریٰ کی طاقت کا خاتمہ کیا جائے اور اس کی ساری سلطنت کو اپنے قبضہ میں لایا جائے۔" اور پھر لکھتا ہے: "دربارِ ایران کے جنگ جویانہ رویہ سے وہ آخر کار مجبور ہو گئے کہ اپنی فوجوں کو حکم دیں کہ ملک ایران پر قبضہ کر لیا جائے۔" یہ اس عیسائی مورخ کے آخری لفظ ہیں اور تعجب ہے کہ اس کے باوجود حضرت عمرؓ پر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ آپ نے محض لوٹ مار کے لئے یا سلطنت کی توسیع کے لئے ایران کو مسخر کیا۔ آپ ایران کی طرف پیشقدمی کرنا نہ چاہتے تھے لیکن ایران چند دنوں میں ہی طاقت پا کر عرب کو پامال کر دیتا۔ ادھر خدا کا کلام بھی پورا ہونا تھا کہ عجمی سرزمینوں کے بھی مسلمان مالک ہو جائیں گے۔ اس لئے خود کسریٰ اور ایرانیوں نے مسلمانوں کو آرام سے بیٹھنے نہ دیا۔

۲۱ھ تا ۲۳ھ / ۶۴۲ء تا ۶۴۴ء

نہاوند کا معرکہ اور ایران پر تسلط

غرض یزدگرد نے ایران کے جنوب سے شمال تک اور مشرق سے مغرب تک ایک آگ لگا دی۔ اور خود مختار قوموں تک بھی اسلام کی طاقت کا خاتمہ کرنے کے لئے اُن کے ساتھ ہو گئیں۔ فیروزان کے ماتحت ڈیڑھ لاکھ فوج ہمدان میں جمع ہو گئی۔ سعد بھی حضرت عمرؓ کو ساتھ ساتھ خبریں پہنچاتے تھے اس لشکر کا قدم آگے بڑھانا مسلمانوں کے لئے نہایت خطرناک تھا۔ ہر طرف سے فوج جمع

لی گئی اور نعمان کے ماتحت یہ لشکر حلوان پہنچا۔ اور یہاں سے آگے چل کر نہاوند کے میدان میں ۲۱ھ میں مقابلہ ہوا۔ نعمان شہید ہو گئے لیکن اسلامی افواج فتحیاب ہوئیں۔ اور دشمن کی فوج کا اکثر حصہ برباد ہو گیا۔ یہاں سے مسلمان رے پر بڑھے۔ یزدگرد خود تو اصفہان کی طرف اور وہاں سے کرمان کی طرف بھاگ گیا۔ اور آخر بلخ میں جا پناہ لی۔ اور اسفندیار کے ماتحت ایرانی افواج نے رے پر مقابلہ کیا۔ مگر حسب معمول شکست کھائی۔ یزدگرد نے خاقان چین سے اور ترکوں سے مدد طلب کی۔ ترکوں کی مدد سے کچھ مدت تک جنگ کرتا رہا۔ لیکن یہ سارا مقابلہ بے سود تھا ادھر اسلامی افواج سارے ایران میں پھیل گئیں۔ اور یکے بعد دیگرے فارس۔ مکران سجستان۔ خراسان اور آذربائیجان پر متسلط ہو گئیں اور یوں سلطنت ایران بکلی مسلمانوں کے ہاتھ آ گئی۔ یہ عجیب بات ہے کہ اگر ایک طرف جزیہ لیا جاتا ہے تو دوسری طرف ایسی بھی اقوام ہیں جو مسلمانوں کو دشمن کے روکنے میں امداد دیتی ہیں۔ تو نہ ان سے جزیہ لیا جاتا ہے نہ وہ اسلام قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ جرجان کے لوگوں سے اسی شرط پر صلح ہوئی تھی۔ کہ جو لوگ بیرونی حملوں کے روکنے میں مسلمانوں کو مدد دینگے اُن سے جزیہ نہ لیا جائے گا۔ ایسا ہی آرمینیہ کے ایک رئیس شہر براز نام کے ساتھ اس شرط پر صلح ہوئی کہ اس سے جزیہ نہ لیا جائیگا۔ بلکہ جب ضرورت ہوگی وہ فوجی امداد دے گا۔ کرمان اور سیستان ۲۳ھ میں فتح ہوئے۔

ابولؤلؤ (فیروز) ایک ایرانی غلام تھا جو رومیوں کے ہاتھ میں پڑ کر عیسائی ہو گیا تھا۔ مغیرہ ۲۳ھ / ۶۴۴ء

حضرت عمرؓ کی شہادت

اس کو اپنے ساتھ عراق سے مدینہ لائے۔ یہاں اُس نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ مغیرہ اُس سے دو درہم روزانہ وصول کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارے پیشہ نجاری کے لئے یہ رقم زیادہ نہیں۔ اس پر وہ ناراض ہو گیا۔ دوسرے دن عین اس وقت جب حضرت عمرؓ نے امامت کرانے کے لئے فجر کی نماز کی نیت باندھی آگے بڑھ کر آپ کو زخمی کیا۔ آپ نے عبدالرحمٰن بن عوف کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کے لئے کھڑا کیا قاتل نے کچھ اور لوگوں کو بھی زخمی کیا۔ اور آخر خودکشی کر لی۔ حضرت عمرؓ نے نماز سے فارغ ہونے پر جب معلوم کیا کہ آپ کا قاتل ایک غیر مسلم ہے۔ تو کہا الحمد للہ کہ ایک مسلمان کے ہاتھ سے میں قتل نہیں

ہوا چونکہ انتڑیاں تک کٹ چکی تھیں اس لئے جانبری کی امید نہ رہی۔ پہلے آپ نے حضرت عائشہؓ سے اجازت طلب کی۔ کہ آپ کے حجرہ میں آنحضرت صلعم کے پہلو میں آپ کو دفن کیا جائے پھر اپنے جانشین کے انتخاب کے لئے چھ سب سے برگزیدہ آدمیوں کو چنا۔ یعنی حضرت عثمانؓ علیؓ۔ زبیرؓ۔ طلحہ۔ سعد بن ابی وقاص۔ عبدالرحمٰن بن عوف اور فرمایا کہ ان چھ شخصوں میں سے جس کے متعلق ان چھ کی کثرت رائے ہو۔ اسی کو خلیفہ بنایا جائے پھر قرض کا حساب کر کر فرمایا کہ میرے متروکہ سے یہ رقم ادا ہو۔ آپ ۲۶ ذالحجہ ۲۳ھ کو زخمی ہوئے۔ تین دن بیمار رہے اور یکم محرم ۲۴ھ کو اپنے دونوں ساتھیوں کے پہلو میں سو گئے

فتوحات فاروقی کی وجوہات

خلافت فاروقی کے عظیم الشان کارناموں میں سب سے پہلے جو امر ہماری توجہ کو کھینچتا ہے وہ اسلام کی فتوحات عظیمہ ہیں۔ سات یا آٹھ سال کے عرصہ میں اس قدر ملک کا فتح کر لینا بجائے خود حیرت انگیز ہوتا لیکن ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نہ صرف ایک ہی وقت میں دو عظیم الشان سلطنتوں کے ساتھ مقابلہ شروع ہو جاتا ہے جن میں سے ہر ایک اس قدر طاقت کی مالک تھی کہ دنوں کے اندر سارے عرب کو لے سکتی تھی۔ بلکہ اس مقابلہ میں مسلمانوں کی فوج بھی کسی ایک میدان میں تیس چالیس ہزار سے نہیں بڑھی۔ حالانکہ بالمقابل ڈیڑھ دو اڑھائی لاکھ تک فوج ہوتی تھی۔ پھر سامان جنگ جو کچھ ان سلطنتوں کو میسر تھا عرب میں اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔ پھر ان میں نظام فوجی ہمیشہ سے موجود چلا آتا تھا۔ عرب میں نہ کبھی اتنی بڑی فوجوں کا اجتماع ہوا تھا نہ گھر سے باہر دور نکل کر کبھی لڑائی کا موقعہ پیش آیا تھا۔ فنون جنگ میں اگر یہ دونوں سلطنتیں پوری ماہر تھیں تو عرب کے لوگ اُن سے اسی قدر بے بہرہ تھے۔ پھر لڑائی عرب کے اندر نہ تھی بلکہ دشمنوں کے ملکوں کے اندر لڑائی تھی جہاں دشمن کیلئے ہر قسم کا سامان سہولت سے پہنچنے کے علاوہ بڑے بڑے مضبوط قلعے سلطنت کی حفاظت کے لئے موجود تھے۔ اس قدر غلبہ کے اسباب ایک طرف ہوتے ہوئے یہ کس قدر تعجب خیز ہے کہ ان تمام لڑائیوں میں سوائے واقعہ جسر کے مسلمانوں کو کسی میدان میں شکست نہیں ہوئی۔ یورپ کے مورخین نے صرف دو وجوہات دی ہیں۔ ایک یہ کہ ایران و روما کی سلطنتیں دونوں کمزور ہو چکی تھیں۔ دوسرے یہ کہ مال غنیمت

کے خیال یا جیسا کہ وہ کہتے ہیں لوٹ مار کے لالچ نے مسلمانوں کو جوش دلایا تھا۔

ان دو وجوہ میں سے وجہ اول یعنی قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کا کمزور ہو جانا گو ایک حد تک درست ہے۔ مگر اس سے فتوحات فاروقی کی تشریح نہیں ہو سکتی

ایران و روما کی کمزوری

یہ ایک علیحدہ امر ہے کہ جس اوج کمال پر یہ سلطنتیں کسی زمانہ میں تھیں اس پر اب باقی نہ رہی تھیں۔ ان کی سابقہ تہذیب مٹ چکی تھی۔ مدت کی باہمی جنگ سے وہ ایک دوسرے کو قدرے کمزور بھی کر چکی تھیں۔ لیکن کیا وہ عرب کے مقابلہ پر کمزور تھیں؟ نہیں کیا عرب کی اُن کے مقابل میں کچھ حیثیت تھی! نہ صرف عرب کا شمالی حصہ قیصر نے اور شرقی حصہ کسریٰ نے دبایا ہوا تھا۔ بلکہ عرب کے لوگ ان حکومتوں سے اس قدر خائف تھے کہ اس علاقہ میں بھی جہاں ان کی حکومت نہ تھی۔ وہ جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ اس کو بھی جانے دو۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو مشرق میں ایران کی اور شمال میں قیصر کی زیادتی سے شروع ہوئی۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا۔ پھر کمزوری تو یہ ہوتی کہ میدان جنگ میں وہ مسلمانوں کے مقابل کافی فوج نہ لا سکتے۔ یا اچھی مسلح فوج نہ لا سکتے حالانکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے مقابل پر ہر میدان میں ان کی فوج کی تعداد دگنی تگنی پانچ گنی تک ہوتی تھی۔ اور ہر قسم کے بچاؤ کے سامان اور ہتھیار بھی فوج کے پاس بافراط ہوتے تھے یہاں تک کہ اُن کے معمولی سپاہی سر سے پیر تک لوہے میں ملبوس ہوتے تھے۔ پس باوجود کسی قدر کمزور ہو جانے کے عرب کے مقابل میں ان دونوں سلطنتوں میں سے ہر ایک کی طاقت اب بھی نہایت زبردست تھی اور دونوں کے اجتماع کے سامنے عرب کی کچھ حیثیت ہی نہ تھی۔ اور عرب میں اور اُن دونوں میں ایک ہی وقت لڑائی کا شروع ہو جانا دو نوع کے اجتماع کے قائمقام تھا۔

دوسری وجہ عربوں کا لوٹ مار کا لالچ بتائی گئی ہے۔ اس وجہ کے بنانے میں گو یورپین

لوٹ مار کا لالچ

تاریخ نویسوں کے موجودہ خیالات کا عکس ہی نظر آتا ہے الاناء یترشح بما فیہ لیکن جن لوگوں نے یہ وجہ بتائی ہے انہوں نے غور نہیں کیا۔ کہ لوٹ مار کے لالچ سے زبردست قومیں کمزور قوموں پر حملہ آور ہوا کرتی ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ ایک کمزور آدمی یا قوم

اپنے سے زبردست آدمی یا قوم پر لوٹ مار کے لئے حملہ آور ہو۔ یہی قانون دنیا کا ہمیشہ سے رہا اور یہی ہمیشہ رہے گا۔ آج یورپ کی زبردست سلطنتیں کمزور قوموں کو دبا رہی ہیں تاکہ ان کے ملکوں سے اقتصادی اور دوسری قسم کے فوائد حاصل کریں۔ یہ بھی مہذب پیرائے میں لوٹ مار ہی ہے۔ لیکن اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی کہ ایک کمزور قوم اپنے زبردست ہمسایہ پر لوٹ مار کے لئے نکلی ہو۔ ڈاکو ہمیشہ نہتوں پر حملہ کرتے ہیں۔ بے خبروں پر حملہ کرتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ ایک مسلح فوج پر جسے اپنے آپ سے زبردست جانتے ہیں۔ حملہ کریں۔ علاوہ ازیں روپے اور مال کے لالچ کا لازمی نتیجہ ہے کہ دنیا اور اس کی محبوب چیزوں سے محبت پیدا ہو۔ اور دنیا سے محبت کا لازمی نتیجہ بزدلی ہے۔ جن لوگوں کی غرض لوٹ مار ہوتی ہے ان کی سب سے پہلی کوشش اپنی جان کو بچانے کے لئے ہوتی ہے۔ لیکن مسلمانوں نے ایران اور روما کے ساتھ لڑائیوں میں جو جان نثاری کے عدیم المثال نمونے دکھائے ہیں وہ صاف بتاتے ہیں کہ دنیا و مافیہا کی محبت سے بہت بلند تر کوئی جذبہ تھا۔ جو ان کے دلوں میں موجزن تھا۔ اور جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو ہر ایک قسم کے خطرہ میں ڈالنا آسان سمجھتے تھے۔ اگر ان کی نگاہ میں دنیا کی دولت اس کی آسایش اس کے آرام کی کوئی قدر ہوتی تو ان میں سے ایک متنفس بھی ایران اور روما جیسی زبردست سلطنتوں کے مقابلہ میں نہ نکلتا وہ جانتے تھے کہ ان طاقتوں کے مقابلہ میں نکلنا۔ اپنے آپ کو موت کے منہ میں دینا ہے اور موت پر ترجیح دینے والی ایک ہی چیز ہے یعنی اپنے فرض کا احساس۔

مسلمانوں کی جرات اور ہمت کے چند نمونے

ایک مختصر تاریخ میں یہ گنجائش نہیں کہ لڑائیوں کی ان تفصیلات کو لکھا جائے جن سے یہ معلوم ہو کہ کس شجاعت کس عزم۔ کس قوت کس ہمت کے مالک مسلمان تھے اور ان لڑائیوں میں انہوں نے کن کن کارہائے نمایاں سے اور کیسے کیسے اظہار شجاعت وجرات سے صفحۂ تاریخ کو روشن کیا ہے دو چار مثالوں سے اس مطلب کو واضح کرتا ہوں۔ جسر کی لڑائی میں جہاں مسلمانوں نے ابو عبید کی غلطی کی وجہ سے شکست کھائی۔ ایرانی فوج کے آگے آگے بڑے بڑے ہاتھی تھے جن پر گھنٹے لٹکتے تھے۔

اور بڑے زور سے بجتے تھے۔ عرب کے گھوڑوں نے یہ نظارہ کبھی نہ دیکھا تھا اور وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ اس وقت سب سے پہلے خود سپہ سالار اپنے گھوڑے سے کودا۔ اور ہاتھیوں کی فوج پر حملہ آور ہوا۔ ان کے ساتھ اور لوگ بھی گھوڑوں سے کود کر پیادہ پا ہو گئے۔ مگر ہاتھیوں کے ریلے کا مقابلہ آسان نہ تھا۔ خود ابو عبید کو ایک مہیب ہاتھی نے گرا کر ہڈیاں پسلیاں کچل دیں۔ تو ان کے بھائی نے جھنڈا ہاتھ میں لیا اور اسی ہاتھی پر حملہ آور ہوا اور اسیطرح ہاتھی کے پاؤں کے نیچے روندا جاکر شہید ہوا۔ مگر عزم و استقلال کی یہ حالت تھی کہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اسی طرح اپنی جان دیتا چلا گیا۔ اور ایک کی موت دیکھکر دوسرے کے پاؤں میں لغزش نہ آتی تھی۔ یہاں تک کہ سات آدمی یکے بعد دیگرے اسی ہاتھی کے نیچے مسلے گئے۔ جو لوگ اس لڑائی میں بھاگے وہ مدت تک جنگلوں میں چھپے پھرتے رہے۔ جو لوگ مدینہ گئے وہ بھی شرم کے مارے روپوش تھے کیوں؟ اس لئے کہ وہ ارشاد الٰہی ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا جس میں یہ ذکر ہے کہ جو شخص دشمن کو پیٹھ دکھاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے نیچے آجاتا ہے[1]۔ قادسیہ کی لڑائی میں طلیحہ رات کے وقت اکیلے دشمن کے ساٹھ ہزار لشکر میں جا گھسے اور ایک قیدی کو ساتھ لیکر لڑتے بھڑتے صحیح سلامت واپس آگئے۔ اسی لڑائی میں ابو محجن ایک مشہور شاعر اور بہادر شراب کے استعمال کی وجہ سے قید کر دیئے گئے تھے۔ مسلمان اپنی قلت تعداد کی وجہ سے پیچھے ہٹ ہٹ جاتے تھے۔ اور ایرانیوں کا پلہ بھاری نظر آرہا تھا اسی حالت میں ابو محجن نے سعد کی بیوی سلمیٰ سے درخواست کی کہ مجھ سے مسلمانوں کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ میری بیڑیاں اتار دو۔ اگر میں زندہ رہا تو خود واپس آکر یہی بیڑیاں پہن لوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور وہ لڑائی میں جاکر صفوں کی صفوں کو الٹتا گیا۔ شام کے وقت لڑائی بند ہوئی تو خود واپس آکر وہی قید کی بیڑیاں پہن لیں۔ سعد کو معلوم ہوا تو انہوں نے کہا کہ ایسے جاں نثار کو قید میں نہیں رکھا جا سکتا۔ ابو محجن نے قسم کھائی کہ آیندہ میں کبھی شراب کو ہاتھ

[1] ومن یولھم یومئذ دبرہ الا متحرفا لقتال او متحیزا الی فئۃ فقد باء بغضب من اللہ وماوٰہ جھنم وبئس المصیر (الانفال ۲-۱۶)

نہ لگاؤں گا۔ مدائن کی فتح کا آخری نظارہ انہی عزم و استقلال کے کارناموں میں سے ایک ہے
سب سے پہلا شخص جس نے درپائے دجلہ کی گہرائی اس کی تیزی اور اس کی موجوں کی پروا
نہ کرتے ہوئے دریا میں اپنا گھوڑا ڈالا خود سعد تھے اور آپ کے ساتھ ہی یکے بعد دیگرے
مسلمان اس طرح اپنے گھوڑے دریا میں ڈالتے چلے گئے گویا کسی خشک ہموار رستہ پر چل
رہے تھے۔ اور سامنے دوسرے کنارہ پر دشمن موجود تھا۔ فحل (شام) کی لڑائی میں جب
عیسائیوں کے قلب کی فوج کمال استقلال سے اپنی جگہ پر جمی ہوئی تھی۔ ہاشم بن عتبہ جو
فوج کے ایک حصہ کے سردار تھے اپنے گھوڑے سے کودے اور قسم کھا کر کہا جب تک
قلب میں اس علم کو نہ گاڑ دوں گا واپس نہیں آؤں گا۔ حمص کی لڑائی میں شرجیل اکیلے
شہر کی طرف بڑھے اور ایک رسالہ نے ان پر حملہ کیا تو اس ثابت قدمی سے لڑے کہ دس
گیارہ آدمیوں کو مار دیا اور رسالہ کو بھگا دیا۔ جنگ یرموک میں عکرمہ بن ابی جہل نے جب
اہل اسلام پر سخت حملہ دیکھا۔ تو کہا کہ میں تو رسول اللہ صلعم سے بھی لڑتا رہا ہوں۔ آج میرا
قدم کفار کے مقابل میں کس طرح پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ چار سو آدمیوں نے اُن کے ساتھ
مرنے مارنے کا پختہ عہد کیا۔ اور ایسی شدت سے حملہ کیا کہ گو خود سب شہید ہو گئے مگر دشمن کے
بھی قدم اکھیڑ دیئے۔ ایک موقعہ پر شرجیل دشمنوں کے نرغہ میں آئے ہوئے سب کا مقابلہ کر
رہے تھے اور یہ آیت پڑھ رہے تھے۔ ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسھم واموالھم
بان لھم الجنۃ اور آواز دے رہے تھے کہ خدا کے ساتھ سودا کرنے والے آئیں۔ دشمن
عورتوں کے خیموں تک پہنچ چکے تھے مگر اس آواز پر لوگوں نے اس طرح آ آکر جانیں فدا
کیں کہ بڑھتا ہوا دشمن پیچھے ہٹ گیا۔ کہیں باپ بیٹوں کو جانیں فدا کرنے کی ترغیب دے
رہا ہے اور کہیں عورتیں خاوندوں کو کہہ رہی ہیں کہ جان دے دو مگر پیچھے نہ ہٹو۔

سپاہیوں اور افسروں کی شجاعت و ہمت کے یہ چند واقعات دکھاتے ہیں کہ ایک ہی

مسلمانوں کی اصل طاقت جس سے وہ غالب آتے تھے

بات تھی جو اُن سے یہ کارنامے نمایاں کراتی تھی۔ اور جس نے
دشمن کی کثرت کا رعب اُن کے دل سے دور کر دیا تھا۔ اور
وہ یہ یقین تھا کہ خدا کے رستے میں یہ ہمارا سب سے مقدم کام ہے۔ ان کے دلوں پر اس وقت

ایک ہی خیال مسلط تھا کہ ہمارا خدا ہم سے یہ چاہتا ہے۔ ان کو اس وقت نہ زندگی کی پروا تھی نہ بیوی بچوں کی محبت اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اور مال و دولت تو ان کی نگاہ میں سب سے حقیر چیز تھی۔ ان کو صرف ایک ہی نشہ اس وقت تھا اور وہ نشہ محبت الٰہی کا تھا۔ محمد رسول اللہ صلعم نے جو قوم پیدا کی تھی ان کے دلوں میں خدا کی ہستی پر یقین ایک میخ کی طرح گاڑ دیا تھا۔ اور ان کے اندر اپنے فرض کا ایسا زبردست احساس پیدا کر دیا تھا کہ اس کے سامنے وہ ہر مقابلہ کو ہیچ سمجھتے اور دنیا کی زبردست سے زبردست طاقت کی پروا نہ کرتے تھے۔ خدا کی ہستی پر ایمان اُن کے دلوں کے اندر ایک زبردست زندہ طاقت کا کام دے رہا تھا۔ وہ کسی کو ناحق دکھ دینے والی قوم نہ تھی۔ لیکن جب دوسرے لوگ حق کو مٹانے کے لئے اٹھتے تھے تو ان کے مقابلہ کے لئے وہ شیروں سے بڑھکر ہوتے تھے۔ خود رسول اللہ صلعم کی زندگی میں یہی نظارہ نظر آتا ہے۔ کہ ہر ایک دکھ اور مصیبت کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور دشمن کی زیادتیوں کو بھی سہتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن جب دشمنوں نے حق کو نیست و نابود کرنے کے لئے تلوار اٹھائی تو کبھی تین سو مسلمان ہزار دشمن پر غالب آتے ہیں۔ اور کبھی سات سو تین ہزار پر اور کبھی پندرہ سو پندرہ ہزار پر یہی نظارہ خلفائے راشدین کے وقت میں نظر آتا ہے انہوں نے قیصر و کسریٰ کو نہیں چھیڑا۔ مگر جب قیصر و کسریٰ نے عرب کو تباہ کرنا چاہا تو دونوں کے اندر انہوں نے ان دونوں سلطنتوں کو تباہ کر کے دکھایا جس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔ اذا ھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہ واذا ھلک قیصر فلا قیصر بعدہٗ۔ ان کی زندگیاں قرآن شریف کی اس آیت کی عملی تفسیر تھیں۔ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ۔ انہوں نے دنیا کو بتا دیا کہ غلبہ کا انحصار نہ کثرت اعداد پر ہے نہ کثرت سامان پر۔ بلکہ دل کی اس قوت پر ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا کی ہستی پر ایک زندہ دلیل تھے۔ اور انہوں نے دنیا کو یہ سبق سکھایا کہ خدا پر ایمان لانے سے انسان کے اندر کیسی قوت پیدا ہو سکتی ہے۔ دنیا خدا کے ساتھ تعلق کے معنی نہیں سمجھتی اور خدا سے تعلق کو ایک قصہ کہانی جانتی ہے ان لوگوں نے یہ دکھا دیا کہ خدا کو

آنکھوں سے نظر نہ آئے۔ مگر اس کے ساتھ تعلق انسان کی حالت کو بالکل بدل دیتا ہے اور ایسی طاقت اس کے اندر پیدا کر دیتا ہے جس کا دنیا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ غرض فتوحات صدیقی اور فتوحاتِ فاروقی دونوں کی اصل وجہ مسلمانوں کا اللہ تعالیٰ کی ہستی پر زندہ ایمان اور اپنے مولیٰ سے سچّا تعلق تھا۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ انہوں نے جو نظارہ اپنی آنکھوں سے رسول اللہ صلعم کی زندگی میں دیکھا تھا اس نے ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان اس قدر مضبوط کر دیا تھا وہ دیکھ چکے تھے کہ کس طرح ایک اکیلا انسان اٹھا جس کو تباہ کرنے کے لئے اس کی اپنی قوم نے ہی نہیں سارے ملک عرب نے بت پرستوں نے۔ یہودیوں نے عیسائیوں نے پورا زور لگایا۔ مگر جو کچھ اس نے بیکسی اور تنہائی کے وقت میں کہا تھا اس کا لفظ لفظ پورا ہوا۔ ہاں اسی نے ان کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ جس طرح عرب کی مخالفت اسلام کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ بلکہ وہی مخالفت اسلام کے غلبہ کا موجب ہوگئی اسی طرح قیصر و کسریٰ کی مخالفت اسلام کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گی بلکہ یہ سلطنتیں خود اسلام کے سامنے گر جائیں گی اور ہر ایک مسلمان کے دل میں یقین تھا کہ مخبر صادق کے یہ لفظ بھی پورے ہو کر رہیں گے اور اس یقین کے سامنے ایران و شام کی افواج اور سامان کی کثرت ان کو ہیچ نظر آتی تھی۔

یہ بھی سچ ہے کہ مسلمانوں کے اندر ان فتوحات سے کثرت سے مال آیا اور اس مال سے انہوں نے فائدہ بھی اٹھایا۔ لیکن مال و دولت کی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ تھی۔ بلکہ وہ ان سامانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ وہ راہبوں کی طرح گوشہ گزین قوم تھی۔ وہ دنیا میں رہتے تھے۔ اور مال و دولت کو بھی خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں سے ایک نعمت سمجھ کر اس کی قدر کرتے تھے مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مال و دولت کے محبوب بنا لینے والی قوم اخلاق فاضلہ کو کھو دیتی ہے۔ حضرت عمرؓ جن کے سامنے یہ فتوحات کا سارا مال آتا تھا کئی دفعہ اس کو دیکھ کر افسوس کرتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ مال و دولت کے لوازم حسد و رشک بھی اس کے ساتھ آجائیں۔ ایران و روما کی ساری دولت نے اُن کے سارے سامانوں نے حضرت عمرؓ کے دل پر ایک ذرہ کے برابر اثر نہیں کیا۔ چاروں طرف سیم و زر کے ڈھیر تھے جواہرات

مادی طاقتوں پر اخلاق کی فتح

کے انبار لگ جاتے تھے جگمگاتے ہوئے سامان تعیش آنکھوں کو چندھیا دیتے تھے۔ مگر اندر وہی دل تھا جسکو محمد رسول اللہ صلعم نے محبت الٰہی سے لبریز کر دیا تھا۔ اور باہر وہی موٹا پیوند لگا ہوا لباس تھا جو غربت و افلاس کے زمانہ میں پہنتے تھے۔ ایک حضرت عمرؓ کیا ایک ایک مسلمان کا جو صحبت رسول میں بیٹھ چکا تھا یہی حال تھا۔ یہ لوگ جب سفیر بن کر قیصر و کسریٰ کے درباروں میں جاتے تھے تو ان کی تمام آرائش کے سامان اُن کی آنکھوں میں پرِ پشہ کے برابر وقعت نہ رکھتے تھے۔ وہ اپنے پھٹے پرانے کپڑوں اور اپنی چیتھڑوں کے اندر لپٹی ہوئی تلواروں کو لئے اس طرح آزادی سے ان درباروں میں جاتے تھے جیسے اپنے گھر میں پھر رہے ہوں۔ بجائے اس کے کہ ان درباروں کا کوئی رعب ان پر ہوتا کسریٰ و قیصر اور ان کے درباریوں پر ان کی سادگی اور لاپروائی سے ہیبت طاری ہو جاتی قادسیہ کی جنگ سے پہلے جب مسلمانوں کا وفد یزدگرد شاہ ایران کے دربار میں گیا تو یزدگرد نے تحقیر کے طور پر عربوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ تم ذلیل قوم ہو۔ تم جب کبھی سرکشی کرتے تھے تو ہم سرحد کے زمینداروں کو بھیجکر تمہیں درست کر دیتے تھے۔ اس پر مغیرہ بن زرارہ نے اٹھ کر کہا کہ واقعی ہم ذلیل اور گمراہ تھے آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے۔ فسق و فجور میں مبتلا تھے لیکن خدا نے ہم میں ایک پیغمبر بھیج کر ہم میں سے ان گمراہیوں اور غلطیوں کو دور کیا اور ہم کو اس بلند مقام پر پہنچایا۔ ربعی بن عامر کو جب رستم کے پاس سفیر بنا کر بھیجا گیا تو کمر میں رسی کا پٹکا باندھا ہوا تھا۔ اور تلوار کے میان پر چیتھڑے لپیٹے ہوئے تھے ساتھ نوکر بھی کوئی نہ تھا۔ دربار میں پہنچے تو گھوڑے سے اتر کر اس کی باگ ڈور کو زریں گاؤ تکیہ سے اٹکا یا اور ایسی لاپروائی سے تخت کی طرف چلے کہ ان کی نگاہ میں دربار کی شان و شوکت کی کچھ بھی حقیقت معلوم نہ ہوتی تھی۔ اس کے بعد مغیرہ گئے تو بڑے ٹھاٹھ سے ایرانی دربار سجا ہوا تھا۔ وہ سیدھے رستم کی طرف بڑھے اور اس کے برابر جا کر بیٹھ گئے اور جب درباریوں نے اس پر اعتراض کر کے نیچے بٹھانا چاہا تو مغیرہ نے کہا کہ تمہاری طرح ہم میں یہ دستور نہیں کہ ایک شخص خدا بن کر بیٹھے اور دوسرے لوگ اس کے سامنے گردنیں جھکا کر بیٹھیں شام کے عیسائیوں کے پاس جب معاذ سفیر بن کر گئے تو زریں فرش بچھا ہوا تھا۔ جب

درباریوں نے اس پر بیٹھنے کو کہا تو فرمایا کہ میں اس فرش پر جو غریبوں کا حق چھین کر تیار ہوا ہے بیٹھنا نہیں چاہتا۔ اور زمین پر بیٹھ گئے جب رومیوں نے کہا کہ ہم تو آپ کی عزت کرنا چاہتے تھے تو فرمایا کہ اگر زمین پر بیٹھنا غلامی کی نشانی ہے تو مجھ سے بڑھ کر خدا کا غلام کون ہو سکتا ہے ان باتوں پر لوگ حیران ہوئے اور پوچھا کہ مسلمانوں میں آپ سے بڑھ کر بھی کوئی ہے۔ تو فرمایا کہ میرے لئے یہی بہت ہے کہ میں سب سے بدتر نہ ہوں۔ جب انہوں نے اپنی کثرت کی طرف توجہ دلائی تو کہا ہمارا خدا فرماتا ہے کہ من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ اسی طرح ان ملکوں کے سفیر مسلمانوں کے پاس آتے تو اُن کی سادگی دیکھکر حیران رہ جاتے رومی قاصد ابوعبیدہ کے پاس آیا تو وہ زمین پر بیٹھے ہوئے تیروں کو دیکھ بھال رہے تھے۔ جب قاصد کو بتایا گیا کہ یہی فوج کے افسر ہیں۔ تو وہ حیران رہ گیا۔ ایک دو واقعات نہیں سینکڑوں واقعات ہیں کہ امیر المومنین سے لیکر غریب سپاہی تک ہر ایک مسلمان خاک نشینی کو اپنا فخر سمجھتا تھا۔ اور دنیا کے مال و دولت کی کوئی وقعت اُن کی نگاہ میں نہ تھی ان کا کمال اُنکے ایمان اور ان کے اخلاق کی وجہ سے تھا۔ بظاہر یہ قوم لڑائیوں میں مشغول تھی مگر اُن کے سینوں کے اندر وہ دل تھے جو راہبوں کو تنہائی کی کوٹھڑیوں میں بیٹھکر بھی نہیں مل سکتے۔ ان کے ہاتھوں میں تیر اور تلواریں تھیں مگر بڑے بڑے اولیاء اللہ کی طرح اُن کے دلوں میں ہر وقت خدا کی یاد تھی اور اس کی عظمت کے سامنے مخلوق خدا پر رحم کے لئے اور دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کے لئے ان کا سر جھکا رہتا تھا۔ ایک نازک موقعہ پر جب فوج کی مستورات کو عیسائی آبادی کی طرف سے خطرہ تھا اور ادھر دشمن کا سامنا تھا تو ابوعبیدہ نے جو افسر تھے کہا کہ اس وقت مناسب یہ ہے کہ ہم عیسائیوں کو شہر سے باہر نکال دیں۔ تو ایک ماتحت افسر نے کہا کہ۔ ہم کو یہ حق حاصل نہیں۔ اس لئے کہ ہم نے انہیں اس شرط پر امن دیا ہے کہ وہ اطمینان سے شہر میں رہیں۔ خود ہرقل نے جب اپنے عیسائی مشیروں سے یہ دریافت کیا کہ عربوں کے ہم پر غلبہ کی کیا وجہ ہے۔ حالانکہ وہ تعداد میں۔ زور میں۔ سامان میں ہم سے کم ہیں۔ تو ایک بڈھے نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے اخلاق ہمارے اخلاق سے اچھے ہیں۔ رات کو عبادت کرتے ہیں۔ دن کو روزے رکھتے

ہیں۔ کسی پر ظلم نہیں کرتے سب ایک دوسرے کو اپنے برابر سمجھتے ہیں۔ اور ہمارا یہ حال ہے کہ شراب پینا اور بدکاری کرنا ہمارا شیوہ ہے۔ عہد کی پابندی نہیں۔ دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اس لئے اُن کے ہر ایک کام میں ہمت اور استقلال ہے دشمنوں کی یہ شہادت بتاتی ہے کہ مسلمان صرف اپنے اخلاق کی وجہ سے غالب آئے اسلام کی فتح فی الحقیقت مادی طاقتوں پر اخلاق کی فتح تھی۔

ان فتوحات کی وجوہات میں میں صرف ایک اور امر کا ذکر کروں گا۔ اور وہ مسلمانوں کا بے نظیر اتحاد تھا۔ اس وقت سے صرف پانچ چھ سال پیشتر ملک عرب خطرناک خانہ جنگیوں اور قومی فسادات کا گھر تھا جس قدر تفرقہ اس ملک میں تھا۔ اسکی نظیر شاید ہی دنیا میں مل سکے۔ قوم قوم کی اور قبیلہ قبیلہ کا دشمن تھا اور پھر ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر لڑائیاں ہو کر مدتوں تک جاری رہتی تھیں۔ اور سالہا سال تک کینے چلے جاتے تھے کوئی شخص نہ کہہ سکتا تھا کہ اس ملک میں اتحاد بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ کہ چند سال کے عرصہ میں ان خطرناک دشمنوں کو ایک کر دیا۔ اور صدیوں کے کینوں کو محبت میں تبدیل کر دیا۔ دنیا کے ان عظیم ترین معجزات میں سے ہے جس کا اقرار مسلم اور غیر مسلم مورخین سب کو یکساں ہے۔ اسی عظیم الشان اتحاد نے مسلمانوں کے لئے ناممکن کو ممکن کر دیا۔ وہی قبیلے اور قومیں جو پہلے ایک دوسرے کی جانی دشمن تھیں اور جنہیں لڑتے عمریں گذر گئی تھیں۔ آج وہ ایک دوسرے کے دوست ہی نہیں تھے۔ ایک دوسرے سے دلی محبت ہی نہ رکھتے تھے بلکہ ایک دوسرے پر جانیں فدا کرتے تھے۔ اگر ایک کی جان خطرے میں ہوتی تو دوسرا اپنے آپ کو فدا کر کے اسے بچا لیتا۔ اگر جنگ میں ایک قوم یا قبیلہ کے آدمی نرغے میں آجاتے تو دوسری قوم یا قبیلہ اُن کے بچانے کے لئے اپنے آپ کو ذبح کرا دیتا ایک پر وار ہوتا تو دوسرے کا سر آگے ہوتا تھا۔ سپاہی افسروں پر اور افسر سپاہیوں پر اپنے آپ کو فدا کرتے تھے۔ دو افسروں یا دو قوموں میں باہم رقابت تک کا خیال باقی نہ رہ گیا تھا۔ کہ کوئی فتح ایک کے نام پر ہو دوسرے کے نام پر نہ ہو۔ ایک ماتحت افسر بھی دشمن کے ساتھ ایک عہد کر لیتا تو وہ مسلمانوں کا عہد سمجھا جاتا۔ ایک ادنیٰ سپاہی بھی ایک ذمہ داری لے لیتا

مسلمانوں کا اتحاد

تو وہ سارے مسلمانوں کی ذمہ داری سمجھی جاتی۔ غرض اس قوم کا بے نظیر اتحاد ان عظیم الشان اسباب میں سے ایک بھاری سبب ہے۔ جس نے اسے کثیر التعداد دشمنوں پر غالب کر دیا۔

اسلام کی جمہوریت

حضرت ابوبکر کی خلافت کے ساتھ اگر اسلامی جمہوریت کا بیج بویا گیا تھا۔ تو حضرت عمر کے زمانے میں اُس نے پورا نشوو نما پایا۔ جمہوریت کا بیج تو اسلام کی تعلیم میں موجود تھا۔ قرآن شریف میں صریح حکم تھا کہ مسلمانوں کی حکومت شوریٰ سے ہوگی[1]۔ خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اہم امور کو مشورہ سے طے کیا کرتے تھے حضرت ابوبکر کی نہ صرف خلافت شوریٰ سے ہوئی بلکہ آپ کے زمانہ میں عظیم الشان پیش آمدہ امور کا فیصلہ مشورہ سے ہوتا تھا۔ حضرت عمر کے زمانہ میں دو طرح کی مجالس شوریٰ کا انعقاد نظر آتا ہے۔ ایک بہت عام اور وسیع جس میں عام اعلان کیا جاتا تھا اور خاص خاص پیش آمدہ امور اس میں طے ہوتے تھے دوسری خاص مجلس جس میں روزمرہ کے امور طے ہوتے تھے یہاں تک کہ عزل ونصب کے معاملات بھی بعض وقت اس مجلس میں طے ہوتے تھے لیکن حضرت عمر نے مشورہ کے اصول کو یہاں تک وسیع کیا تھا کہ مدینہ کے علاوہ بیرونجات کے لوگوں کو بھی مشورہ کے لئے بلا لیا کرتے تھے۔ بلکہ غیر مسلموں یا ذمیوں سے بھی مشورہ لیتے تھے عراق کے بندوبست میں وہاں کے پارسی رئیسوں کو بلا کر مشورہ لیا مصر کے انتظام میں مقوقش وہاں کے سابق حاکم سے مشورہ طلب کیا۔ اور ایک قبطی کو مدینہ میں منگوایا عام رعایا کو بھی یہاں تک معاملات سلطنت میں دخل دیا تھا کہ عموماً صوبوں کے گورنر رعایا سے دریافت کر کے مقرر کئے جاتے تھے اور جب کسی جگہ کی رعایا کسی گورنر کے متعلق شکایت کرتی تھی تو شکایت کی تحقیقات کر کے اسے الگ کر دیتے تھے۔ ایسی شکایات پر آپ نے بڑے بڑے صحابیوں کو الگ کر دیا۔ یہاں تک کہ سعد بن ابی وقاص فاتح ایران کو کوفہ کی گورنری سے صرف وہاں کے لوگوں کی شکایت پر الگ کر دیا۔ حالانکہ اُنکے خلاف کوئی ایسا الزام نہ تھا جس کی وجہ سے انہیں معزول کیا جاتا۔ مگر آپ کا اصول یہ تھا کہ گورنر پبلک کا ایسا ملازم ہونا چاہئے۔ جس سے وہاں کی پبلک خوش ہو۔ شاید ابھی تہذیب مشکل سے اس مقام پر پہنچی ہے۔ جہاں عرب کے امی آج سے تیرہ سو سال پہلے پہنچ چکے تھے

---

[1] وامرھم شوریٰ بینہم (الشوریٰ ۴ع ۳۸)

بعض وقت حضرت عمر خاص مقامات پر گورنر مقرر کرنے کے لئے وہاں کے لوگوں کو لکھ بھیجا کرتے کہ وہ اپنے میں سے ایک موزوں اور نیک آدمی کا انتخاب کر کے خود اطلاع دیں چنانچہ کوفہ شام بصرہ کے لوگوں کو آپ نے یوں ہی لکھا۔ اور اس سب پر یہ کہ ہر شخص کو آزادی سے اپنی رائے دینے کا موقعہ تھا۔ بلکہ اضلاع سے آپ کے پاس ہر سال وفد آتے رہتے تھے۔ جو وہاں کے حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ اور اپنے خطبوں اور وعظوں میں حضرت عمر اس بات پر خصوصیت سے زور دیتے تھے۔ کہ لوگ اس آزادی رائے سے فائدہ اٹھائیں۔ رائے کی آزادی گویا ایک مسلمان کا ہی نہیں ہر انسان کا پیدائشی حق قرار دیا گیا۔ اور لوگوں سے رائے لینے کے لئے ہر قسم کے ذرائع جو اس وقت ممکن تھے اختیار کئے گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خلیفہ یا بادشاہ کی حیثیت ایک معمولی مسلمان کے برابر قرار دی گئی۔ نہ صرف یہ کہ خلیفہ کو اسی قدر وظیفہ ملتا تھا جس قدر دوسرے مسلمانوں کو بلکہ مقدمات میں خلیفہ اگر مدعا علیہ ہو تو اسی طرح عدالت میں حاضر ہوتا تھا جس طرح عام آدمی۔ ابی بن کعب کیساتھ حضرت عمر کا کچھ جھگڑا ہوا تو زید بن ثابت کی عدالت میں بطور مدعا علیہ حاضر ہوئے۔ زید نے کچھ آپ کی عزت کرنی چاہی تو آپ ناراض ہوئے کہ یہ طرفداری ہے۔ غرض جمہوریت کو جس کمال پر حضرت عمر نے پہنچایا آج تک بھی دنیا کو وہ کمال جمہوریت نصیب نہیں ہوا اصول شوریٰ کو حضرت عمر نے یہاں تک قوت دی کہ وہ اپنی ذات کے متعلق بھی بغیر شوریٰ کوئی فیصلہ نہ کرتے تھے۔

حضرت عمر کی شجاعت

ایران کے بعض معرکوں میں جب مسلمانوں کے لئے سخت خطرہ اور مقابلہ کا وقت تھا تو آپ نے خود بھی کئی دفعہ ان لڑائیوں میں شریک ہونے کا ارادہ کیا۔ لیکن اہل الرائے کے مشورہ پر اس ارادہ کو ترک کر دیا۔ یہ بزدلی نہ تھی بلکہ اصول شوریٰ کا انتہائی تتبع تھا۔ کہ اپنے ارادہ کو بھی شوریٰ کے ماتحت کر دیا۔ یوں آپ کی شجاعت ایک ایسی چیز ہے جس کا دشمن و دوست دونوں کو یکساں اعتراف ہے۔ اسلام لانے سے پیشتر ملک عرب میں آپ کی شجاعت اور بہادری کا خاص شہرہ تھا اور آپ کے اسلام لانے کے ساتھ اسلام میں ایک نئی قوت پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے کفار کو بھی سخت فکر ہوا۔ شجاعت کا انحصار قوتِ قلب پر ہے۔ اور آپ کی قوتِ قلب کا یہ

حال تھا کہ دنیا کی دو عظیم الشان طاقتوں نے عرب کو کچلنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ان کی فوجیں دونوں طرف لاکھوں کی تعداد میں اڈی چلی آتی تھیں۔ مگر آپ نے اس کی پروا تک بھی نہیں کی۔ بلکہ دونوں کی شرارتوں کی انتہائی سزا دیئے بغیر تلوار رکھنے کا نام نہیں لیا۔ اس قدر قوت قلب کا انسان دنیا میں تلاش کرنے سے مشکل ملیگا۔ یہ آپ کی قوت قلبی کا ہی کمال تھا کہ آپ کا رعب نہ صرف دشمنوں پر تھا بلکہ دوستوں پر بھی باوجود آپ کی کمال درجہ کی سادگی کے اس قدر رعب تھا کہ بڑے سے بڑے فاتح آپکے احکام کے آگے سر نہ ہلا سکتے تھے۔ جب خالد جیسے عظیم الشان فاتح کی معزولی کا حکم پہنچا اور اُن پر حساب نہ دینے کا الزام لگایا گیا تو آپ کے قاصد نے عین میدان جنگ میں اس کے ہاتھ باندھ لئے اور وہ مقابلہ کی جرأت نہیں کر سکے۔ اور بعد میں جب اُن کے منہ سے کچھ لفظ نکلے جن کا مفہوم یہ تھا کہ میری خدمات کی قدر نہیں کی گئی تو کسی شخص نے کہا کہ ایسی بات سے فتنے کا خطرہ ہے خالد نے کہا لیکن عمر کے ہوتے ہوئے کسی فتنہ کا خطرہ نہیں۔ سعد فاتح ایران کو کوفہ کی گورنری سے معزول کر دیا تو وہ بغیر چون وچرا کے گورنری کو چھوڑ کر دربار میں حاضر ہو گئے۔ شجاعت کا اظہار میدان جنگ میں ہی نہیں ہوتا گو حضرت عمر نے آنحضرت صلعم کے زمانے میں میدان جنگ میں بھی بارہا اپنی بےنظیر شجاعت کا اظہار کیا۔ مگر خلافت کے زمانے میں جس قوت قلبی اور جس شجاعت کا اظہار آپ نے کیا وہ واقعی اپنی نظیر آپ ہی ہے۔

حضرت عمر کی سادگی اور رعایا کی فکر

اپنے زمانہ خلافت میں حضرت عمر نے بادشاہی کے فرض کو اس حد تک ادا کیا کہ اس بارے میں بھی ان کی نظیر تلاش کرنے سے نہیں ملیگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق نبوی حضرت عمر کے قلب میں عکس پذیر ہو گئے تھے جس طرح نبی کریم صلعم نے کسی قسم کا کام کرنے کو عار نہیں سمجھا یہی حال حضرت عمر کا تھا بیت المال کے بیمار اونٹوں کی خبر گیری خود کر لیتے تھے انہیں رال تک اپنے ہاتھ سے ملتے تھے اگر اونٹ گم ہو گیا تو اس کی تلاش میں خود نکل جاتے تھے۔ ایران کی جنگ کے دنوں میں بڑے بڑے تشویشناک حالات بھی پیش آئے۔ خبر کے انتظار میں آپ خود دور تک باہر نکل جاتے تھے۔ جس دن قاصد فتح کی خبر لایا تو آپ اس کی سواری کے ساتھ ساتھ دوڑتے آتے

تھے اور اس سے باتیں کرتے آتے تھے۔ اور اسے خبر نہ تھی کہ یہ بادشاہ وقت ہے۔ ہرمزان ایران کے ایک حصہ کا حاکم قید ہو کر آپ کے پاس آیا تو خلیفہ وقت کو مسجد کے فرش پر خاک پر لیٹے ہوئے پایا۔ فتح بیت المقدس پر عہدنامہ پر دستخط کرنے کے لئے ملک شام میں گئے تو وہی اپنا موٹا اور پیوند لگا ہوا لباس پہنے رہے۔ اور افسران فوج نے لباس بدلنے کے لئے منت سماجت کی تو انہیں جھڑک دیا کہ ان کپڑوں سے ہماری کوئی عزت نہیں۔ عرب میں قحط پڑا تو خود غلہ کی بوریاں اٹھا کر بھوکی مخلوق کو پہنچاتے تھے۔ راتوں کے وقت قحط زدوں کے ڈیروں میں پھرتے تھے۔ اور ضرورت ہوتی تو آٹا لا کر خود کھانا پکانے میں بھی مدد دیتے تھے۔ ایک عورت کو دیکھا کہ اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں۔ اور بچے بھوکے رو رہے ہیں تو بھاگے گئے اور تین میل کے فاصلہ پر خود آٹے کی بوری اٹھا کر لے گئے۔ کسی نے عرض کیا کہ امیر المومنین میں اٹھا لیتا ہوں تو فرمایا یہاں تو تم اٹھا لوگے قیامت کے دن کون میرے بوجھ کو اٹھائے گا۔ رعایا کی ادنیٰ سے ادنیٰ تکالیف کی خبر رکھتے تھے اور ہر ایک قسم کی شکایات سننے کے لئے ہر وقت آپ کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ کسی شکایت کرنے والے کو کسی وقت آپ کے پاس جانے کی رکاوٹ نہ تھی بلکہ اپنے گورنروں کو بھی یہی حکم دے رکھا تھا۔ کہ کوئی دربان دروازہ پر نہ بٹھائیں جو لوگوں کو حاکم کے پاس پہنچنے سے روکے بلکہ ہر وقت شکایات سننے کے لئے دروازہ کھلا رہے۔ لوگ آپ سے بڑی بڑی سختی کر لیتے تھے۔ مگر آپ ان کو کچھ نہ کہتے تھے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے بار بار کہا اتق اللہ یا عمر لوگوں نے اسے روکنا چاہا تو فرمایا کہنے دو۔ اگر یہ لوگ نہ کہیں تو کس کام کے ہیں۔ حضرت خالد کی معزولی پر جب آپ نے وجہ بیان کی تو ایک شخص نے اٹھ کر کہا اے عمر تو نے انصاف نہیں کیا۔ تو نے رسول اللہ صلعم کے عامل کو الگ کر دیا۔ اور اس تلوار کو نیام میں کر دیا جسے رسول اللہ صلعم نے نکالا تھا تو نے قطع رحمی کی اپنے ابن عم پر حسد کیا۔ حضرت عمر نے اسے ڈانٹا نہیں بلکہ اس قدر فرمایا کہ تمہیں اپنے بھائی کی حمایت میں غصہ آگیا۔

حضرت عمر کی ہمدردی صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھی۔ عیسائیوں اور دیگر غیر مسلم

غیر مسلموں سے سلوک اور ہمدردی

اقوام سے جن کا آپ سے تعلق پڑا ایسی ہی ہمدردی تھی بستر مرگ پر فرمایا کہ جو شخص میرے بعد خلیفہ ہو میں اسے وصیت کرتا ہوں کہ اہل ذمہ کے حقوق کا خاص خیال رکھے اور انہیں ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے۔ ذمیوں کی جان و مال کو مسلمانوں کی جان و مال کی طرح قرار دیا۔ اگر مسلمان عیسائی کو قتل کر دیتا تو قاتل کو سزائے قتل دی جاتی۔ معاملات ملکی میں ان سے مشورہ لیا جاتا۔ ایک دفعہ کسی سفر میں آپ نے دیکھا کہ چند ذمیوں کو جزیہ نہ دینے کی وجہ سے ایذا دی جا رہی ہے۔ وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ وہ واقعی نادار ہیں آپ نے انہیں چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ مذہبی امور میں ان کو پوری آزادی حاصل تھی۔ ذمیوں کی سازشوں اور بغاوتوں پر اگر سزا بھی دی تو بہت ہلکی اور ان کو تباہ کرنا نہ چاہا۔ خیبر کے یہودیوں اور نجران کے عیسائیوں کو ان کی سازشوں کی وجہ سے دوسری جگہ بسانے کا حکم دیا۔ تو ساتھ ہی ان کی جائدادوں کی پوری قیمت بیت المال سے ادا کر دی اور ان کے سفر میں ان کے ساتھ ہر طرح کی رعایت کے احکام دیئے۔ ایک وقت تک کے لئے انہیں جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا۔ مسلمانوں کی زکوٰۃ کے مال سے آپ عیسائی فقراء کو بھی دلاتے تھے ایک بوڑھے عیسائی کو مانگتے دیکھا تو نہ صرف اسے جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا بلکہ یہ حکم دیا کہ اسے بیت المال سے وظیفہ دیا جائے۔ اور پھر اسے عام کر دیا کہ بڑھاپے میں ان لوگوں سے یہ سلوک مناسب نہیں ان کو بیت المال سے وظائف دیئے جائیں۔ اس قدر رواداری کی مثال تلاش کرنے سے مشکل ملے گی۔ کہ فاتح اور مفتوح قوم کے حقوق کو ہر طرح برابر کر دیا۔ اور ان کے اپاہجوں اور ضعیفوں کی خبرگیری کو اسی طرح ضروری قرار دیا جس طرح مسلمانوں کی خبرگیری۔ جزیہ کو سختی قرار دینا محض ناواقفی ہے۔ مسلمان جزیہ سے بڑھ کر زکوٰۃ ادا کرتے تھے۔ اور پھر فوجی خدمت بھی ان سے لی جاتی تھی۔ آج کونسی گورنمنٹ ہے جو اپنی رعایا سے حفاظت ملک کے لئے ٹیکس وصول نہیں کرتی۔ اور متعدد مثالیں موجود ہیں کہ جہاں کسی قوم یا سردار نے حفاظت ملکی میں حصہ لینے کا وعدہ کیا تو اسے جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا۔ باوجود بادشاہ قوم ہونے کے اور فاتح ہونے کے مسلمان عیسائیوں کی دل آزاری کو بھی برداشت کر لیتے

تھے ایک عیسائی نے علی الاعلان آنحضرت صلعم کو گالی دی تو ایک صحابی نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا عیسائی نے عمرو بن العاص سے شکایت کی صحابی نے کہا کہ یہ اپنے گرجا میں جو چاہیں کہیں لیکن علی الاعلان انہیں جناب رسالتمآب کو گالیاں دینے کا حق نہیں۔ آنحضرت صلعم کے لئے گالی سن کر ایک صحابی کا عیسائی کو صرف ایک تھپڑ مارنا بتاتا ہے کہ مسلمانوں میں کس قدر مذہبی رواداری تھی ہاں بعض باتیں جن میں فساد کا احتمال تھا اُن سے روکا بھی تھا۔ مثلاً یہ کہ اہل اسلام کی مجلس میں صلیب کا جلوس نہ نکالا جائے اور نماز کے اوقات میں ناقوس نہ بجایا جائے۔ سؤروں کو مسلمانوں کے احاطوں کی طرف نہ لے جایا جائے۔ جن کو لوگوں نے عمومیت دے کر غلطی سے یوں سمجھ لیا ہے کہ عیسائیوں کو مطلق صلیب نکالنے یا ناقوس بجانے یا سؤروں کے باہر لے جانے سے روکا گیا تھا۔ ایسا ہی حضرت عمر نے حکم جاری کیا تھا کہ عیسائی اقوام میں سے جو لوگ مسلمان ہو جائیں ان کی نابالغ اولاد کو عیسائی بپتسمہ نہ دیں۔ اس کو یوں ظاہر کیا جاتا ہے کہ عیسائیوں کو مطلق اصطباغ سے ہی روکا گیا تھا۔

حضرت عمر کے زمانے میں عورتوں کی حالت

عرب میں عورتوں سے تشدد کا سلوک ہوتا تھا۔ اور حضرت عمر کا تشدد اس بارے میں مشہور ہے۔ حجاب کے حکم کے نزول سے پہلے آپ آنحضرت صلعم سے عرض کیا کرتے تھے کہ امہات المومنین کو پردہ میں رہنا چاہیئے۔ لیکن جس قسم کا پردہ آج کل مروج ہے وہ حضرت عمر کے زمانے میں نظر نہیں آتا۔ آپ کے ہاں ایک صحابی مہمان آئے تو آپ کی بیوی خود کھانا وغیرہ کھلاتی تھیں۔ بازار کے انتظام کے لئے آپ نے ایک بی بی کو مقرر کر رکھا تھا۔ آپ کے زمانے کی لڑائیوں میں عورتیں نہ صرف ویسے لشکر کے ساتھ رہتی تھیں۔ بلکہ زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کرتی تھیں اور بعض لڑائیوں میں شامل ہوتیں۔ سعد فاتح ایران کی بیوی سلمیٰ کا واقعہ مشہور ہے جن کے پاس ابو محجن نے حاضر ہو کر اپنی زنجیریں اتروائیں اور لڑائی میں شامل ہونے کی اجازت لی۔ عورتوں کا وعظ کے جلسوں یا دیگر اہم موقعوں پر شامل ہونا بھی ثابت ہے۔ جب آپ نے مہر کے کم کرنے پر خطبہ دیا تو ایک عورت نے ہی اٹھ کر کہا تھا کہ خطاب کے بیٹے

تم کسطرح ہمارے مہروں کو کم کرسکتے ہو اللہ ہمیں دیتا ہے کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ ایک عورت کو سونے کا ڈھیر بھی دینا جائز ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا نساء المدینۃ افقہ من عمر مدینہ کی عورتیں عمر سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ جب آپ نے قرآن شریف کی تعلیم کو عرب میں لازمی کیا تو لڑکوں لڑکیوں میں کوئی فرق نہیں کیا۔ غرض جہاں تک اُن کے فرائض خانہ داری اجازت دیتے تھے عورتیں مردوں کے پہلو بہ پہلو کام کرتی تھیں۔ اور پردہ میں جو تشدد آج پایا جاتا ہے۔ اس کا کوئی وجود حضرت عمر کے زمانہ تک نظر نہیں آتا۔ بلکہ عورتوں کو ایسے معزز عہدے بھی دیئے گئے جیسے بازار کا انتظام۔

غلاموں کی آزادی

حضرت عمر کے عظیم الشان کارناموں میں سے یہ ہے کہ آپ نے غلامی کے رواج کو بہت کم کر دیا۔ عرب کے متعلق صاف حکم دے دیا کہ اہل عرب غلام نہیں بنائے جائیں گے یہ غلامی کو مٹانے کی تمہید تھی۔ اگر بعد کے بادشاہ اس کو ذرا اور توسیع دیتے تو مسلمانوں میں سے غلامی کا رواج آج سے بارہ صدیاں پیشتر دور ہو جاتا۔ اور یہی قرآن شریف کا منشا تھا کہ غلامی کو تدریجاً کم کر کے بالکل موقوف کر دیا جائے۔ غیر اقوام کے قیدیوں کو بھی آپ بہت حد تک آزاد ہی کرتے رہے۔ عموماً اس زمانہ میں جنگ کے قیدیوں کو غلام کی حیثیت دی جاتی تھی۔ اور عام آبادی کو تو کسی صورت میں نہ چھیڑا جاتا تھا۔ مگر حضرت عمر جنگ کے قیدیوں کو بھی آزاد ہی کرتے رہے۔ مصر کے تمام اسیران جنگ کو آپ نے اپنے ملک کو واپس کر دیا۔ مناذر کے اسیران جنگ کو بھی آزاد کر دیا۔ معاہدات میں جو جان و مال کی حفاظت و امن کا ذکر ہوتا تھا تو اسکے بھی یہی معنی تھے کہ انہیں غلام نہ بنایا جائیگا۔ پھر آپ نے یہ بھی حکم دیا کہ جس لونڈی سے کسی کے گھر میں اولاد ہو جائے اسے خرید و فروخت نہ کیا جائے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایسی لونڈیاں فی الحقیقت نکاح میں ہوتی تھیں۔ اور حضرت عمر نے اس حکم کے ساتھ کسی غلطی کو ہی دور کیا تھا۔ ورنہ شریعت کے احکام کو وہ کم و بیش نہ کرسکتے تھے باایں جو کچھ غلام تھے اُن کے ساتھ بھائیوں کی طرح سلوک کرتے تھے اور یہی دوسروں کو نصیحت کرتے تھے۔

مساوات حقوق انسانی کے بارے میں تو حضرت عمر کا اپنا طریق عمل ہی ایک بے نظیر نمونہ

مساوات سب سے آپ نے بادشاہ ہو کر دوسروں پر اپنے نفس کو کسی قسم کی ترجیح نہ دی۔ جب وظائف مقرر ہوئے تو جو وظیفہ سب اہل بدر کو ملتا تھا وہی خود لیا یعنی پانچ ہزار درہم سالانہ۔ آپکے بیٹے عبداللہ نے جب شکایت کی کہ اسے اسامہ بن زید سے کم وظیفہ دیا گیا ہے تو فرمایا کہ زید آنحضرت صلعم کے نزدیک تمہارے باپ سے زیادہ پیارا تھا۔ بلال رضہ عمار رضہ وغیرہم کو جو پہلے غلام تھے مگر اسلام میں اولیت رکھتے تھے۔ بڑے بڑے قریش کے سرداروں پر ترجیح دیتے تھے۔ گورنروں کے مقرر کرنے میں کبھی اپنے خاندان یا خاندان بنی ہاشم (یعنی رسول اللہ صلعم کے خاندان) کو ترجیح نہیں دی۔ بڑے بڑے عامل اگر کسی شخص پر زیادتی کرتے تو اُن سے قصاص دلواتے۔ جبلہ بن ایہم کا واقعہ مشہور ہے۔ یہ شام کا مشہور رئیس تھا۔ طواف میں اس کی چادر کو کسی شخص کا پاؤں لگ گیا۔ تو اس نے اسے تھپڑ مارا۔ اس نے بھی یہی سلوک جبلہ سے کیا۔ حضرت عمر کے پاس شکایت ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ مسلمان سب مساوی ہیں۔ ریاست اور مرتبہ کے ہونے یا نہ ہونے سے حقوق میں کچھ فرق نہیں پڑتا جس پر جبلہ ناراض ہو کر مرتد ہو گیا۔ عمرو بن العاص نے مصر میں منبر بنایا تو فرمایا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ دوسرے مسلمان نیچے بیٹھیں اور تم اوپر بیٹھو۔ اُن کے اپنے بیٹے ابوشحمہ نے شراب پی تو دُنیٰ کوڑے لگوائے (البتہ اس قصہ میں جو اور رنگ آمیزیاں کی جاتی ہیں وہ صحیح نہیں)، تمام قسم کے خاندانی فخروں کو بھی آپ نے مٹا دیا۔ اور ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کا عَلَم جامہ تو قوم کو پہنا دیا اس سے بڑھ کر مساوات کیا ہو سکتی تھی۔ کہ سب عاملوں سے یہ عہد لیا جاتا تھا کہ باریک کپڑا نہیں پہنیں گے چھنا ہوا آٹا نہیں کھائیں گے۔ حاجت مندوں کے لئے دروازہ ہمیشہ کھلا رکھیں گے۔ اور دروازہ پر کوئی دربان کسی کو روکنے کے لئے نہ رکھیں گے۔ جب حکام وقت سے اس اصول پر کام لیا جاتا تھا تو مساوات کیوں نہ ہوتی۔ یہ وہ مساوات ہے جس کی نظیر اب بھی کسی مہذب قوم میں نہیں ملتی۔

رفاہ عام اور عامہ ہمدردی مخلوق مخلوق کی عام ہمدردی کے جس قدر کام حضرت عمر نے کئے وہ آج بھی کسی مہذب قوم میں نظر نہیں آتے۔ ضعیفوں اور اپاہجوں کے وظائف بیت المال سے مقرر کر دیئے۔ اور مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہ کیا۔ اولاً پنشن کا اصول

یورپ میں آج معلوم ہوا ہے لیکن حضرت عمر نے سب سے پہلے یہ کام کر کے دکھایا یا مسافروں کے لئے عموماً بڑے بڑے شہروں میں مہمان خانے تعمیر کرائے۔ لاوارث بچوں کے لئے خصوصیت سے احکام جاری کئے کہ ان کی پرورش بیت المال سے کی جائے۔ قحط کے ایام میں اس قدر مستعدی سے کام کیا کہ شب و روز مخلوق خدا کی فکر میں اپنے آپ کو بھی بھلا دیا۔ بلکہ گوشت تک کھانا ترک کر دیا۔ شاعروں وغیرہ پر روپیہ برباد نہ کرتے تھے جب شام میں طاعون سے ہزارہا مسلمان فوت ہو گئے تو اُن کے اموال اور اولاد کا انتظام کرنے کے لئے خود گئے۔ راتوں کو اکثر پھرتے اور لوگوں کے حالات کو دیکھتے تھے۔ ایک دفعہ اسی طرح پھر رہے تھے کہ ایک اعرابی کے پاس اُس کے خیمہ کے باہر بیٹھ گئے باتیں کر رہے تھے کہ اندر سے رونے کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ اعرابی کی بیوی اکیلی ہے اور دردِ زہ میں مبتلا ہے۔ اسی وقت اپنی بیوی ام کلثوم کو ساتھ لائے۔ اور بچہ کی ولادت تک اُس کے پاس رہے اسی طرح ایک رات ایک عورت کو دیکھا کہ چولہے پر کچھ چڑھایا ہوا ہے۔ اور بچے رو رہے ہیں۔ معلوم ہوا کھانے کو کچھ نہیں۔ ہانڈی میں صرف پتھر ہیں۔ دوڑے گئے اور خود اپنی پیٹھ پر آٹا وغیرہ اٹھا لائے۔ اور کھانا پکانے میں اس کو مدد دی۔

اشاعت اسلام اور تعلیم قرآن

گو آپ کے زمانہ میں اشاعت اسلام کے لئے کوئی خاص نظام قائم نہیں کیا گیا تھا۔ اور ضروریات ملکی نے مجبور کر دیا تھا کہ اول قوم کی حفاظت کا فکر کیا جائے لیکن لڑائیوں تک میں بھی اس بات کو مدنظر رکھتے۔ کہ صاحب علم لوگوں کو افسر مقرر کیا جائے۔ تاکہ وہ ساتھ ساتھ اشاعت اسلام کا کام بھی کر سکیں۔ مسلمانوں کو حکم تھا کہ جہاں جائیں اسلام پیش کریں۔ جس سے یہ غلط نتیجہ نکالا گیا ہے کہ وہ تلوار یا اسلام پیش کرتے تھے وسعت سلطنت کے ساتھ البتہ یہ موقعہ کھل آتا تھا کہ ان قوموں کے سامنے اسلام پیش کیا جائے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا عملی نمونہ ایسا تھا کہ بے اختیار دل اسلام کی طرف کھچے چلے آتے تھے عرب کے شمالی حصہ اور شام کی اکثر عرب اقوام نے جو محض عیسائیت کی بادشاہت کی وجہ سے عیسائی تھیں نئے مذہب کی خوبیوں کو دیکھ کر فوراً اسلام قبول کر لیا۔ یہی حالت عراق کی اقوام کی تھی۔ ایران میں بھی کئی برسرِ بڑے مجوسی روسا مسلمان ہو گئے۔

اور اُن کے ساتھ ان کی رعایا میں بھی خاص تحریک اسلام کے لئے پیدا ہوگئی۔ مصر میں بھی اسلام کثرت سے پھیلتا چلا گیا۔ ہر ایک مسلمان کی سادگی۔ اخلاص۔ نیکی ایک واعظ کا کام دیتی تھی۔ اور لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ بعض جگہ دو دو چار چار ہزار کی تعداد میں اکٹھے مسلمان ہو جاتے رہے اور اسلامی افواج میں نومسلموں کی خاص تعداد ہوتی تھی۔ فسطاط کا شہر جب آباد ہوا تو اس میں بعض محلوں کے محلے نومسلموں کے تھے اور صرف یہی نہیں تھا کہ لوگ مسلمان ہوتے ہوں۔ بلکہ ان کی تعلیم کا انتظام بھی ساتھ کا ساتھ ہوتا تھا۔ مفتوحہ علاقوں میں معلم مقرر کرکے ان کی تنخواہیں خزانہ سرکاری سے ادا کی جاتی تھیں چنانچہ حضرت عمرؓ کے خاص کارناموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ نے معلموں کی تنخواہیں مقرر کیں۔ اور پھر بدوؤں تک کے لئے قرآن کریم کی تعلیم لازمی تھی۔ اور ایک شخص کو اس کام پر مقرر کیا گیا تھا۔ کہ وہ قبائل میں دورہ کرکے امتحان لے اور جو لوگ اس سلسلہ تعلیم سے فائدہ نہ اُٹھاتے تھے انہیں سزا دے۔ پھر بعض بڑے بڑے صحابہ جیسے ابو ایوب۔ ابو درداء۔ عبادہ کو ملک شام میں بھیجا کہ وہاں مسلمانوں کی تعلیم قرآن کا انتظام کریں۔ اور انہوں نے حمص۔ دمشق فلسطین میں ٹھہر کر وہاں کے لوگوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔ فوجی لوگوں کو بھی خاص طور پر ہدایات دی جاتی تھیں۔ کہ وہ قرآن شریف سیکھیں چنانچہ یہ لوگ لڑائیاں بھی کرتے تھے اور قرآن شریف بھی پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک ایک فوج میں کئی کئی سو حافظان قرآن شریف ہوگئے۔

نظام حکومت اور ترتیب دفاتر

فتوحات کے ساتھ ساتھ نظم و نسق ملکی کے کام میں بھی حضرت عمرؓ نے اپنی کمال قابلیت دکھائی اگر صرف فتح کرکے ممالک کو چھوڑ دیتے تو دوسرے دن وہ ہاتھ سے نکل جاتے۔ مگر آپ کا انتظام ایسا اعلیٰ درجہ کا تھا اور مفتوح قوموں کے ساتھ سلوک ایسا اچھا تھا کہ مفتوح علاقوں کے لوگوں میں پہلے سے زیادہ خوشحالی آگئی۔ جوں جوں کوئی علاقہ فتح ہوتا تھا اُس کے ساتھ ہی اُس کے نظم و نسق کا پورا انتظام فرماتے تھے۔ ہر ملک کو صوبوں میں تقسیم کیا۔ زمینوں کی پیمائش کرائی۔ مردم شماریاں کرائیں۔ ہر قسم کے دفاتر قائم کیے۔ پولیس کا انتظام کیا۔ جیل خانے بنوائے۔ فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ نہریں کھدوائیں۔ شہر

بسائے عدالتیں قایم کیں۔ بیت المال قایم کیا۔حضرت عمر کے عہد میں ہی سنہ ہجری بھی قایم ہوا جس سے تاریخ کی حفاظت میں مدد ملی۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اپنی عظیم الشان فتوحات ملکی کے باوجود اور اعلیٰ درجہ کے نظم ونسق کی قابلیت کے باوجود حضرت عمر بادشاہ نہ تھے۔ بلکہ صحیح معنوں میں رسول اللہ صلعم کے خلیفہ تھے۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت میں بادشاہت نے ذرا بھی فرق نہیں ڈالا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ باوجود ایک عظیم الشان شہنشاہ ہونے کے اور قیصرو کسریٰ کی دولت کے مالک ہونے کے اسی سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ جس طرح رسول اللہ صلعم کے زمانہ عسرت میں۔ کھانا بالکل سادہ ہوتا تھا۔ بلکہ جب قحط پڑا تو آپ نے روغن زیتون اور گوشت بھی ترک کر دیا۔ لباس میں کئی کئی پیوند لگے ہوتے تھے۔ مال و دولت ان کی نگاہ میں ایک حقیر شے تھی۔ بلکہ اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ مال و دولت مسلمانوں کے لئے ابتلا کا موجب نہ ہو جائے۔ کوئی خاص دارالامارۃ آپ نے نہیں بنوایا سب کاروبار مسجد میں طے ہوتے تھے وہیں مجلس شوریٰ بھی ہوتی تھی۔ وہیں فرش پر بیٹھ کر سفیروں اور دیگر معززین ایران و روم سے ملاقات بھی کر لیتے تھے۔ اسی طرح دوسروں کا کام کر دیتے تھے۔ جیسے آنحضرت صلعم کے خصایل میں ہے باہر سے آئے ہوئے خطوط خود گھروں میں جا کر دے آتے تھے۔ قوم کی امانت کا حق ادا کرنے میں اپنی ذمہ داری کا احساس اس قدر تھا کہ ہر وقت یہی فکر دامنگیر رہتا تھا کہ عنداللہ جوابدہی کرنی ہو گی اور بڑی سے بڑی فتوحات پر کسی قسم کا تکبر نہیں کیا۔ چار ملکوں کے مالک تھے مگر زمین پر اس قدر حلیمی اور فروتنی سے چلتے تھے کہ جیسے عاجز سے عاجز انسان۔ بیت المال کی کسی چیز کو سوائے اس کے جو لوگوں نے مشورہ کر کے آپ کا روزینہ مقرر کر دیا تھا۔ اپنے لئے جائز نہ سمجھتے تھے یہاں تک کہ ایک دفعہ کسی خاص شکایت پر شہد کی ضرورت ہوئی تو جب تک مجلس شوریٰ نے اسکی منظوری نہیں دی بیت المال سے شہد بھی نہ لیا۔ حضرت سلمان نے ایک دفعہ آپ کے استفسار پر کہا کہ اگر آپ لوگوں سے کچھ ناحق وصول کرتے یا بیت المال سے بے جا خرچ کرتے ہیں تو آپ بادشاہ ہیں ورنہ خلیفہ۔ سو آپ نے اس امانت کو کمال راستبازی سے ادا کر کے بتا دیا کہ آپ کہنے کو شہنشاہ تھے مگر آپ نے اپنا اصل منصب خلافت رسول اللہ صلعم سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھا۔

حضرت عمر صحیح معنوں میں خلیفہ رسول تھے۔

حضرت عثمانؓ

یکم محرم سنہ ۲۴ ہجری تا ۱۸ ذوالحج سنہ ۳۵ ہجری ، نومبر سنہ ۶۴۴ء تا ۱۷ جون سنہ ۶۵۶ء

سنہ ۲۴ تا ۳۵ھ
سنہ ۶۴۴ تا ۶۵۶ء

حضرت عثمان کا انتخاب

حضرت عمرؓ نے انتخاب خلافت کے لئے بہترین ممکن انتظام کیا تھا۔ آنحضرت صلعم کے بعد حضرت ابوبکر کی طرف سب نظریں اٹھتی تھیں اور ان کے بعد حضرت عمر کی طرف اس لئے ان دونوں بزرگوں کے انتخاب میں کوئی دقت پیش نہ آئی لیکن حضرت عمر کے بعد کوئی فرد واحد ایسا نہ تھا کہ جسکو دوسروں پر وہی فوقیت حاصل ہو جو حضرت ابوبکر اور عمر کو اپنے اپنے وقت میں حاصل تھی۔ حضرت عمر اپنی زندگی میں کہا کرتے تھے کہ اگر میری وفات کے وقت حضرت ابوعبیدہ بن الجراح زندہ ہوں تو وہ خلافت کے اہل ہیں۔ مگر ابوعبیدہ فوت ہو چکے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی طرف بھی بہت نظریں اٹھتی تھیں۔ اور اپنی شہادت کے وقت حضرت عمر نے انہیں امام نماز بنایا تھا۔ مگر وہ خود اس بار کو اٹھانا پسند نہ کرتے تھے۔ باقی عظیم الشان آدمی جو اس منصب کی اہلیت رکھتے تھے۔ وہی تھے جن کو حضرت عمرؓ نے انتخاب کے لئے نامزد کیا تھا۔ یعنی حضرت عثمان جن کی عمر اس وقت ستر سال کے قریب تھی اور جن کی مالی خدمات اسلام اپنی جگہ پر بے نظیر تھیں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے ان کی زوجیت میں آ چکی تھیں۔ حضرت علی جن کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسب و صہر دونوں لحاظ سے نہایت قریبی تھا۔ یعنی آپ کے چچازاد بھائی بھی تھے اور آپ کے داماد بھی۔ اور قوت بازو کے لحاظ سے اور علم و فضل کے لحاظ سے بھی منصب خلافت کی اہلیت رکھتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص فاتح ایران جن کو گو حضرت عمر نے کوفہ کی گورنری سے الگ کر

دیا تھا مگرو بالکل معمولی شکایت پر تھا اور انتظام سلطنت میں خاص قابلیت رکھتے تھے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور بوجہ اپنی خدمات اسلامی کے خاص وقعت و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آنحضرت صلعم کی حفاظت میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں کرکے دکھائے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان چھ کو اپنے میں سے ایک آدمی کثرت رائے سے انتخاب کرنے کی ہدایت کی تھی۔ اور اس سے بہتر صورت ناممکن تھی۔ اگر رائے عام پر انتخاب کو چھوڑا جاتا تو فساد کا خطرہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ تین دن سے زیادہ انتخاب میں نہ لگیں۔ آپ کی وفات کے بعد مشورہ شروع ہوا۔ آخر سب کے اتفاق سے عبدالرحمن بن عوف کے ہاتھ میں یہ فیصلہ چھوڑا گیا۔ طلحہ موجود نہ تھے باقی میں سعد کی رائے حضرت عثمان کے حق میں تھی۔ زبیر نے عثمان و علیؓ کا نام لیا۔ حضرت عثمان سے انہوں نے دریافت کیا کہ اگر میں آپ کا انتخاب نہ کروں تو پھر آپ کے نزدیک کون خلافت کا اہل ہے انہوں نے حضرت علی کا نام لیا۔ حضرت علی سے ایسا ہی سوال کیا تو انہوں نے حضرت عثمان کا نام لیا۔ یوں خود حضرت عبدالرحمن بن عوف کو الگ کرکے انتخاب کنندگان میں حضرت عثمان کی طرف کثرت رائے تھی۔ اس کے علاوہ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے دیگر اعیان امت سے بھی اس میں استصواب کیا۔ اور اس وقت مختلف اطراف عرب سے بوجہ حج کے لوگوں کا خاصہ اجتماع تھا۔ تو ان کی کثرت رائے بھی حضرت عثمان کی طرف ہی تھی۔ اس لئے چوتھے دن صبح حضرت عبدالرحمن نے حضرت عثمان کے حق میں فیصلہ کیا اور سب لوگوں نے آپ سے بیعت کی۔ یہ نئے سال کا پہلا دن تھا۔ یعنی یکم محرم ۲۴ ہجری کو آپ خلیفہ منتخب ہوئے۔ بیعت ہو چکنے کے بعد طلحہ بھی آگئے۔ حضرت عثمان نے اُن سے واقعات بیان کرکے فرمایا کہ اگر تمہاری رائے میرے حق میں نہ ہو تو میں اب بھی خلافت سے علیحدہ ہونے کو تیار ہوں۔ مگر انہوں نے بھی اپنا اتفاق ظاہر کیا۔ اور بیعت کرلی۔

ایران میں بغاوت اور مزید فتوحات

حضرت عمرؓ کی وفات کے وقت ایران میں بالکل امن تھا۔ مگر آپ کی وفات کے کوئی چھ ماہ بعد ایران میں بغاوت شروع ہوئی اور عہدنامے توڑ دیئے گئے۔ اس بغاوت کی اصل وجہ یہ تھی کہ یزدگرد گو جلاوطن تھا۔ مگر ابھی

تک زندہ تھا اور اگر ایک طرف اس کی سازشوں کا سلسلہ تھا تو دوسری طرف اہل ایران کی نظر امید بھی کسریٰ کے خاندان پر تھی۔ اس لئے حضرت عثمان کو اس بغاوت کو فرو کرنے کیلئے افواج کو بھیجنا پڑا۔ اور ہر جگہ بغاوت کو فرو کر کے از سر نو معاہدات کئے گئے۔ بغاوت کے سد باب کے لئے اسلامی افواج کو حدود ملک کی طرف پیشقدمی کرنی پڑی۔ کیونکہ بغاوت کی ابتدا یہیں سے ہوتی تھی۔ اس لئے ایران کی دوبارہ فتح میں مملکت اسلام کی اور زیادہ توسیع ہو گئی۔ ایک طرف بلخ اور ترکستان میں اسلامی جھنڈا لہرانے لگا۔ اور دوسری طرف ہرات کابل اور غزنی تک کے حاکموں نے اطاعت اختیار کی۔ خراسان کا اکثر حصہ نیشاپور طوس مرو وغیرہ ۳۰ھ ہجری میں فتح ہوئے ۳۱ھ ہجری میں یعنی حضرت عثمان کی خلافت کے آٹھویں سال یزدگرد نے وفات پائی۔ ۳۲ھ ہجری میں آذربیجان کے پہاڑی دروں میں مسلمانوں کا ترکوں سے مقابلہ ہوا۔ اور گو یہاں پہلے پہلے اسلامی فوج کو نقصان پہنچا مگر کمک پہنچ جانے پر اس کی تلافی ہو گئی اور حضرت عثمان کی خلافت میں نہ صرف حضرت عمر کے وقت کے مفتوحہ علاقوں میں دوبارہ امن قائم ہوا۔ بلکہ مشرق اور شمال کی طرف حدود سلطنت وسیع ہوتی چلی گئیں۔

شام پر قیصر کا حملہ۔ مسلمانوں کی مزید فتوحات اور قبرص پر قبضہ

ملک شام میں حضرت عمر نے معاویہ کو گورنر دمشق مقرر کیا تھا۔ آہستہ آہستہ ملک شام سب کا سب ایک ہی گورنر کے ماتحت آ گیا۔ ایک مدت سے قیصر کی حکومت کی طرف سے قریباً خاموشی تھی لیکن حضرت عثمان کی خلافت کے دوسرے سال میں قیصر کی افواج ایشیائے کوچک کی طرف سے پھر شام پر حملہ آور ہوئیں۔ معاویہ کے پاس اس قدر فوج نہ تھی کہ وہ اکیلے حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکتے۔ حضرت عثمان نے مدد بھیجی اور اس کے ساتھ قیصر کی افواج کو شکست دی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی اسلامی افواج ایشیائے کوچک میں پھر نکلیں۔ اور آرمینیا میں سے ہو کر طبرستان تک پہنچ گئیں جہاں وہ ایرانی افواج سے جا ملیں۔ پھر شمال کا رخ کر کے طفلس اور بحیرہ اسود تک پہنچ گئیں۔ اس کے بعد قسطنطنیہ کی افواج سے مسلمانوں کو ہر سال مقابلہ پیش آتا رہا۔ اور شامی افواج اپنی سرحدات کی مضبوطی میں لگی رہیں۔ اسی سلسلہ میں ۲۸ھ ہجری مطابق ۶۴۹ء عیسوی میں قبرص کے جزیرہ پر بھی مسلمانوں

کا قبضہ ہوگیا۔ حضرت معاویہ نے حضرت عمر کو بھی لکھا تھا کہ قبرس کا جزیرہ شام کی سرحد سے اسقدر قریب ہے کہ کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی سنی جا سکتی ہے۔ مگر حضرت عمر نے بحری جنگ کی اجازت نہ دی۔ اب جو قیصر کی طرف سے حملوں کا سلسلہ بند ہونے میں نہ آتا تھا تو معاویہ نے حضرت عثمان کو لکھا۔ اور انہوں نے قبرس پر فوج کشی کی اجازت دی۔ چنانچہ اہل قبرس نے وہی خراج جو وہ قیصر کو دیتے تھے مسلمانوں کو دینا منظور کیا۔

مصر پر قیصر کا حملہ اور افریقہ میں مزید فتوحات

مصر میں عمرو بن العاص فاتح مصر گورنر تھے۔ ۲۵ھ ہجری مطابق ۶۴۶ء عیسوی میں قیصر نے سمندر کی طرف سے سکندریہ پر حملہ کیا۔ اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ مگر عمرو نے جلدی سکندریہ کو دوبارہ مسخر کر لیا۔ اور مصر امن میں ہوگیا۔ مگر مغرب کی طرف رومیوں کا مقابلہ برابر جاری تھا۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح جن کے ارتداد کا قصہ مشہور ہے اور فتح مکہ کے وقت حضرت عثمان کی سفارش پر انہیں معافی دی گئی تھی حضرت عثمان کے رضاعی بھائی تھے۔ اور ایک قابل منتظم تھے۔ حضرت عمر نے انہیں بالائی مصر کے انتظام پر مقرر کیا تھا۔ اب ان کا عمرو بن العاص کے ساتھ بعض انتظامی معاملات میں جھگڑا ہوگیا۔ حضرت عثمان نے عمرو بن العاص کے خلاف فیصلہ دیا اور بالآخر انہیں مدینہ بلا لیا گیا اور مصر کی حکومت پر عبداللہ بن سعد کو مقرر کیا گیا۔ حضرت عمر کے زمانے میں طرابلس اور برقہ تک مسلمانوں کا تصرف ہو چکا تھا۔ لیکن رومی افواج برابر اڑی ہوئی تھیں۔ اور کوئی فیصلہ کن جنگ اس طرف نہ ہوئی تھی۔ عبداللہ کو مصر کی حکومت پر مقرر کرنے کے بعد حضرت عثمان نے انہیں مغرب کی طرف رومی مقابلہ کا فیصلہ کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ جب تک یہاں رومی فوج موجود تھی مسلمانوں کو مصر میں امن نہ مل سکتا تھا۔ گریگری (جرجیر) یہاں کے حاکم کے پاس ایک لاکھ بیس ہزار فوج کا اجتماع تھا۔ اس لئے مزید اسلامی فوج بھی بھیجی گئی۔ عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمر بھی اس فوج میں تھے۔ لڑائی نے طول کھینچا آخر جرجیر کو عبداللہ بن زبیر نے قتل کیا۔ اور یونانی افواج کو شکست ہوئی۔ یہ ۲۶ھ ہجری کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد ۳۱ھ ہجری میں پھر ایک کوشش سلطنت روملنے کی اور پانچ سو جہازوں کا بیڑا تیار کر کے بھیجا۔ بالمقابل عبداللہ بن سعد نے بھی بیڑا تیار کیا۔ یہ رومی بیڑے سے بہت چھوٹا تھا۔ مگر

جب مقابلہ ہوا۔ اور کشتی سے کشتی ملکر دست بدست لڑائی کی نوبت پہنچی تو رومی بیڑے کو شکست ہوئی۔ لیکن عبداللہ کی فتوحات کے باوجود مسلمانوں کو اس کے خلاف شکایات پیدا ہونے لگیں۔

حضرت عثمانؓ کی خلافت میں فتنہ کا اصل موجب۔

ان واقعات سے ظاہر ہوگا کہ حضرت عثمانؓ کی حکومت میں نظام سلطنت کسی طرح کمزور نہیں ہوا جہاں بغاوت ہوئی فرو کی گئی۔ سرحدات کو وسیع کر کے مضبوط کیا گیا۔ اور بہت سے نئے ممالک مملکت اسلام میں شامل ہوئے۔ بحری لڑائیوں میں بھی جن میں مسلمان بالکل ناواقف تھے اسی طرح فتح و ظفر اسلامی افواج کے ہمرکاب تھی جس طرح حضرت عمرؓ کے زمانے میں بری لڑائیوں میں مسلمانوں میں وہی زندگی اور قوت موجود تھی جو اس سے پیشتر ہم دیکھ چکے ہیں۔ لیکن اندر ہی اندر کچھ اسباب جمع ہو رہے تھے نئے مفتوحہ ممالک میں مجوسی۔ یہودی۔ عیسائی کثرت سے داخل اسلام ہو چکے تھے۔ اور بعض دشمنان اسلام بھی اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے منافقت کے رنگ میں اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ مملکت اسلام کی سب سے بڑی خوبی اسکے نظام حکومت کی پرلے درجے کی جمہوریت تھی۔ اور مساوات اور آزادی رائے پر کسی قسم کی روک نہ تھی۔ گورنروں تک شکایت پہنچانے کے لئے اس قدر سہولت دی گئی تھی۔ کہ اُن کی ڈیوڑھی پر کوئی دربان نہ ہوتا تھا۔ جو روک ٹوک کر سکے۔ اور ہر ایک شکایت کرنیوالا جس وقت چاہتا گورنر کے پاس پہنچ سکتا تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ گورنروں کی شکایت ہونے پر اُن کو الگ کر دیا جاتا تھا۔ اور خلیفہ کا دربار ہر وقت کھلا تھا جہاں لوگ آتے اور جب گورنر سے ان کو ذرا بھی تکلیف پہنچے اسے معزول کرا کر اپنے حسب منشا نیا گورنر مقرر کرا لیتے۔ بلکہ اس جمہوریت میں خود خلیفہ کی شخصیت ایک معمولی مسلمانوں کیطرح تھی۔ اور وہ بادشاہ نہیں قوم کا خادم سمجھا جاتا تھا۔ اس کے خلاف بھی جو شخص جہاں چاہتا شکایت کر سکتا تھا۔ اس کے انتظام پر حرف گیری کر سکتا تھا۔ اسی آزادی کو بعض لوگوں نے خلافت اسلامی میں کمزوری پیدا کرنے کا موجب قرار دیا ہے۔ مگر یہ آزادی بجائے خود بری چیز نہ تھی۔ بلکہ اسلام کا بہترین پھل اور نسل انسانی کا سب سے بڑا حق تھا۔ ایک شریر آدمی ایک اچھی

چیز کو بھی بری طرح استعمال کر سکتا ہے۔ جہاں یہ نظام حکومت جمہوریت مساوات آزادی رائے کے بہترین پہلو کو لئے ہوئے تھا۔ وہیں اس میں شریر لوگوں کو شرارت کا بھی بڑا موقعہ مل سکتا تھا۔ کیونکہ ہر مسلمان نظام حکومت میں حصہ دار تھا۔ مدینہ میں تو اکثر وہی لوگ تھے جنہوں نے نبی کریم صلعم کی صحبت سے فیض پایا تھا۔ یا اُن کی اولاد تھی جو بیشتر انہی کے نقش قدم پر چلتی تھی مگر بصرہ اور کوفہ اور فسطاط کی نئی آبادیوں میں ہر قسم کے لوگ رہتے تھے۔ انہی مقامات سے اسی آزادی کے حق کی بد استعمالی سے وہ فتنہ اٹھا جس نے حضرت عثمان کی خلافت کے آخری ایام کو بدنام کر کے حضرت عثمان کی شہادت تک نوبت پہنچائی۔ ورنہ آپ کی حکومت کے اول و آخر میں جیسا تاریخ نویسوں کا خیال ہے کوئی خاص فرق نہیں۔

گورنروں کا عزل ونصب

سب سے بڑا الزام جو حضرت عثمان پر دیا جاتا ہے وہ گورنروں کے عزل ونصب کے متعلق ہے۔ کہا گیا ہے کہ آپ کی خلافت کے پہلے چھ سال آپ سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ آپ کو قریش حضرت عمر کی نسبت اچھا سمجھتے تھے۔ مگر پچھلے چھ سال میں آپ نے اپنے عزیزوں اور قریبیوں کو عامل بنانا شروع کر دیا۔ اور اُن کے خلاف جو شکائتیں آتی تھیں اُن کی پروا نہ کرتے تھے۔ یہ زہری کا قول ہے جو امام سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں نقل کیا ہے۔ آپ کے خلاف جن لوگوں نے بغاوت کر کے آخر آپ کو قتل کیا وہ ایسے ہی الزام آپ پر دیتے تھے۔ اب ہم تاریخی واقعات کو لیتے ہیں۔ جو کچھ شکایات ہوئی ہیں وہ تین مقامات کے گورنروں کے متعلق ہی ہیں۔ یعنی بصرہ۔ کوفہ۔ مصر ملک شام میں حضرت عمر کے وقت سے معاویہ گورنر تھے اور حضرت عثمان کے ایام خلافت میں وہی گورنر رہے۔ کوفہ میں حضرت عمر کی وفات کے وقت مغیرہ گورنر تھے۔ حضرت عمر کی خواہش کے مطابق جس کا انہوں نے مرتے وقت اظہار کیا حضرت عثمان نے سعد بن ابی وقاص کو دوبارہ کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ سعد نے ابن مسعود سے جو خزانہ کے مہتمم تھے کچھ روپیہ بطور قرضہ لیا۔ ابن مسعود نے کچھ عرصہ بعد اس کی واپسی پر اصرار کیا۔ جس پر اُن میں اور سعد میں تکرار ہو کر جھگڑے تک نوبت پہنچی اس جھگڑے کا اثر اہل کوفہ پر پڑا جو کچھ سعد کے طرف دار ہو گئے اور کچھ ابن مسعود

کے نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۵ھ ہجری میں حضرت عثمان نے سعد کو کوفہ کی گورنری سے الگ کر کے ولید بن عقبہ کو گورنر مقرر کیا۔ ولید ماں کی طرف سے رشتہ میں حضرت عثمان کے بھائی تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ حضرت عثمان کی خلافت کی ابتدا کا ہے۔ اور اس وقت کم سے کم کسی نے حضرت عثمان پر رشتہ داروں کے تقرر کا الزام نہیں دیا۔ ولید کے خلاف یہ شکایت ہوئی کہ وہ شراب پیتا ہے۔ اور جب شکایت کرنے والوں نے اس کا کچھ ثبوت بہم پہنچایا (جسکو یقینی طور پر آج بھی صحیح نہیں کہا جاسکتا) تو حضرت عثمان نے نہ صرف ولید کو واپس بلا لیا بلکہ اس پر حد بھی قایم کی جس سے کم سے کم حضرت عثمان کی اس معاملہ میں بریت ہوتی ہے۔ کہ وہ رشتہ دار گورنروں سے بازپرس نہ کرتے تھے۔ آپ کی غیر طرفداری کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے کہ شکایت پر نہ صرف گورنر کو الگ کر دیا بلکہ اس پر حد بھی قایم کر دی ولید کے بعد ۳۰ھ ہجری میں سعید بن العاص کو آپ نے کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ یہ بھی حضرت عثمان کے عزیزوں میں سے تھے اور نقص یہ تھا کہ نوجوان اور ناتجربہ کار تھے۔ اور کوفہ کے حالات زیادہ خطرناک ہوگئے۔ اس جگہ شرارت کا بیج بھی بویا جا رہا تھا۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔ آخر جب سعید کی غیر حاضری میں کوفہ میں مفسد گروہ کا غلبہ ہوگیا تو حضرت عثمان نے ۳۴ھ ہجری میں سعید کو بھی الگ کر کے ابو موسیٰ اشعری کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ اور مفسدوں کے لئے کوئی بہانہ باقی نہ چھوڑا۔ بصرہ میں ابو موسےٰ اشعری حضرت عمر کی وفات کے وقت گورنر تھے۔ ۲۹ھ ہجری میں وہاں کے لوگوں نے اُن کے خلاف شکایتیں کیں اور الزام یہ دیا کہ یہ قریش کی طرفداری کرتے ہیں۔ حضرت عثمان نے انہیں الگ کر کے ایک ایسے شخص کو گورنر مقرر کیا جسے اُن لوگوں نے خود نامزد کیا تھا۔ مگر چونکہ وہ اس منصب کا اہل ثابت نہ ہوا اس لئے جلد اس کی جگہ عبداللہ بن عامر کو گورنر مقرر کیا۔ یہ بھی حضرت عثمان کے رشتہ داروں میں سے تھے اور گو اُن پر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے عہدے اپنے رشتہ داروں کو دے دیئے۔ لیکن ایران کی تسخیر اور نئے ممالک کی فتوحات میں انہوں نے بڑے کارہائے نمایاں کئے۔ اور حضرت عثمان کے اس انتخاب کو واقعات نے درست ثابت کیا۔ مصر کی گورنری عمرو بن العاص کے سپرد تھی۔ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو حضرت عمر نے بالائی مصر میں مقرر کیا تھا حضرت

عثمان نے مالی انتظام کو عبداللہ بن سعد کے سپرد کیا۔ اور انتظامی گورنر عمرو بن العاص کو رہنے دیا۔ مگر یہ صورت دیر تک نہ رہ سکی۔ اور دونوں میں جھگڑا ہونے پر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے حضرت عثمان نے عمرو بن العاص کو واپس بلا لیا اور مصر کی گورنری عبداللہ بن سعد کو دے دی۔ اُن کا تعلق آپ سے رضاعی بھائی ہونے کا تھا۔ مگر افریقہ کی فتوحات اور ایسا ہی بحری جنگ میں فتح جو مسلمانوں کیلئے بالکل ایک نیا تجربہ تھا بتاتی ہیں کہ حضرت عثمان پر یہ الزام نہیں دیا جا سکتا کہ انہوں نے محض رشتہ داروں کی پرورش کے لئے گورنریاں تقسیم کی ہوئی تھیں اور آخر جب باغیوں نے مدینہ پہنچ کر اُن کے عزل کا مطالبہ کیا تو حضرت عثمان نے اسے بھی قبول کر کے باغیوں کے نامزد کردہ آدمی محمد بن ابو بکر کا تقرر مصر کی گورنری پر کر دیا۔

گورنروں کے ان عزل و نصب کے واقعات سے یہ ظاہر ہے کہ گو یہ تو صحیح ہے کہ

رشتہ دار گورنروں کے تقرر میں حضرت عثمان پر کوئی الزام نہیں دیا جا سکتا

حضرت عثمانؓ نے گورنریوں پر اپنے رشتہ داروں کا بھی تقرر کیا۔ لیکن اول تو رشتہ داری کا مفہوم وسیع ہے یعنی یہ لوگ اُن کے قریبی رشتہ دار نہ تھے۔ اور دوسرے ان پر طرفداری کا الزام صحیح نہیں اگر وہ اپنے رشتہ داروں کا تقرر کرتے تھے تو جب کسی گورنر کے متعلق وہاں کے لوگوں کی شکایت پہنچتی تھی۔ اسے موقوف بھی کر دیتے تھے بلکہ اپنے ایک رشتہ دار گورنر پر شراب خواری کے جرم میں حد لگا کر اسے کوڑوں سے سزا بھی دلوائی۔ اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا انتخاب گو اس میں رشتہ داروں کی طرف رجحان بھی ہو قابلیت پر ہوتا تھا اور ایران اور افریقہ کی فتوحات میں اُنکے رشتہ داروں نے کارہائے نمایاں بھی کر کے دکھائے۔ اور یہ صحیح نہیں کہ آپکی خلافت کے پہلے چھ سال میں آپ رشتہ داروں کو مقرر نہ کرتے تھے۔ بعد میں کرنے لگے۔ ولید کو کوفہ میں آپ نے خلافت کے دوسرے سال یعنی ۲۵ھ ہجری میں مقرر کیا۔ اور عبداللہ بن سعد کو خلافت کے تیسرے سال یعنی ۲۶ھ ہجری میں مقرر کیا۔ اور اس وقت آپ کے خلاف اس بنا پر کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اس بات کو بھی مان لینے میں ہرج نہیں کہ اگر حضرت عثمان حضرت عمر کے اصول پر چلتے اور حتی الوسع رشتہ داروں کی بجائے دوسروں کو گورنریوں پر مقرر کرتے تو کم سے کم بغاوت کی سازش کرنے والوں کو یہ کہہ کر عام

مسلمانوں کو دہوکا دینے کا موقعہ نہ ملتا۔ کہ آپ اپنے رشتہ داروں کی طرفداری کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد حضرت علی کی خلافت کے زمانہ میں بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے بھی زیادہ تر بنی ہاشم کو ہی ترجیح دی۔ ممکن ہے کہ اس وقت کے حالات ایسے ہو گئے ہوں اور ممکن ہے کہ اُن کی رائے میں وہی لوگ ان عہدوں کے قابل ہوں۔

حضرت عثمان کے زمانہ میں جو فتنہ رونما ہوا اس کی اصل بنیاد ابن سبا نے رکھی۔ یہ

فتنہ کا اصل بانی ابن سبا

اصل میں یمن کا ایک یہودی تھا جس کی ماں حبشی عورت تھی اسی وجہ سے وہ ابن السوداء بھی کہلاتا تھا حضرت عثمان کی خلافت پر آٹھواں سال شروع ہوا تھا۔ اور عبداللہ بن عامر بصرہ کے گورنر تھے جب ابن سبا وہاں پہنچا اور اسلام لانے کی خواہش ظاہر کی۔ بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں اسے اسلام سے کچھ تعلق نہ تھا۔ بلکہ خلافت اسلامی کو برباد کرنے کے لئے یہ اُس نے ایک چال چلی تھی۔ مگر شروع شروع میں اُس نے صرف حضرت عثمان کے گورنروں کے خلاف کارروائی شروع کی۔ بصرہ کے گورنر کو جب اس کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے وہاں سے اس کے اخراج کا حکم دیا۔ یہاں سے یہ کوفہ پہنچا اور کوفہ سے شام اور بالآخر مصر پہنچا۔ اور گو وہ ہر جگہ سے جہاں جاتا تھا اپنی مفسدانہ تقریروں کی وجہ سے نکالا جاتا تھا۔ لیکن چونکہ ایک متفنی اور چالباز شخص تھا اس لئے ہر جگہ اس کے کچھ نہ کچھ ہم خیال پیدا ہوتے چلے گئے اور یوں یہ شخص بصرہ اور کوفہ میں اپنے مفسدانہ خیالات پھیلانے میں کامیاب ہو گیا۔ صرف ملک شام حضرت معاویہ کی دور اندیشی کی وجہ سے اس کی شرارت سے محفوظ رہا۔ مصر میں پہنچ کر اس نے علی الاعلان حضرت عثمان اور آپ کے عمال کی مخالفت شروع کی اور اس کو مذہبی رنگ دینا شروع کیا۔ اور یہ تعلیم دینی شروع کی کہ حضرت علی آنحضرت صلعم کے وصی ہیں۔ اور حضرت عثمان کی خلافت غاصبانہ ہے۔ اور ان باتوں کو اس نے مصر تک محدود نہ رکھا۔ بلکہ اپنے ایجنٹوں کے ساتھ خط و کتابت کے ذریعہ سے دیگر مقامات بالخصوص بصرہ اور کوفہ میں بھی پھیلانا شروع کیا اور لوگوں کو حضرت عثمان کی حکومت کے خلاف اکسانا شروع کیا۔ اور اس کی باتوں سے بہت لوگ دہوکے میں آ گئے۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ حضرت عمرؓ کے وقت میں کثرت سے عرب کے کناروں کی قومیں اور عجمی لوگ بھی داخل اسلام بالخصوص عراق عرب میں جہاں بصرہ اور کوفہ آباد ہوئے اسلام نے خوب ترقی کی یہ نئے لوگ جو اسلام میں داخل ہوئے تھے ان کی واقفیت اسلام سے عموماً بہت گہری نہ ہوتی تھی رلیکن آزادی رائے اور مساوات کا جو دروازہ اسلام نے کھولا تھا اور جس کو صحابہؓ نے عملی جامہ پہنایا تھا۔ اس میں نئے اور پرانے سب لوگ یکساں حصہ دار تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ نئے لوگ آزادی اور مساوات کے صحیح استعمال سے واقف نہ تھے۔ حضرت عمرؓ نے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے خود ایسی راہیں پیدا کی تھیں کہ لوگ اپنی رائے کا آزادی سے اظہار کر دیا کریں۔ بلکہ خود لوگوں کو بلا بلا کر دریافت کرتے تھے کہ کسی عامل کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف تو نہیں۔ آج اس آزادی اور تہذیب کے زمانے میں بھی حکام کے تقرر میں لوگوں کو اس قدر دخل نہیں جیسا خلافت اسلامی میں تھا۔ اب بعض شورہ پشتوں نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اور بعض لوگ اپنی ناواقفیت کی وجہ سے اُن کے دام میں آ گئے۔ گورنروں۔ پر علے الاعلان جو چاہتے الزام دیتے تھے۔ کوئی روک نہ سکتا تھا۔ اور ابن سبا کے ہمخیالوں نے اب فرضی الزام بعض گورنروں پر لگا کر لوگوں کو دہوکا دینا شروع کیا۔ عام لوگ ان کی تحقیقات نہ کر سکتے تھے ایک اور بات جو اس فتنہ کے پھیلنے میں معاون ہو گئی یہ تھی کہ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر عموماً قریش ہی ہوتے تھے منصوبہ باز لوگوں نے اس خیال کو بھی پھیلانا شروع کیا کہ وہ بہادر بدوی قومیں جن کے زور بازو سے فتوحات حاصل ہوئی ہیں ان کو اعلیٰ عہدوں سے محروم کیا جاتا ہے بات تو صحیح تھی مگر قریش عرب قوم کیلئے بمنزلہ دماغ کے تھے اس لئے اعلیٰ درجہ کی ذمہ داری کے عہدوں کے لئے جہاں محض بہادری بکار نہ تھی انہی کا تقرر عمل میں آتا تھا۔ مگر اس خیال نے بدوی عرب اقوام کے دل میں حکومت کی طرف سے ایک اور شکایت پیدا کر دی۔ اور یوں وہ بھی نادانستہ اُن کے دہوکے میں آ گئے

ترقی فتنہ کے بعض اسباب

صحابہ میں سے ابوذر ایک درویش منش آدمی تھے اور ابتدائی زمانہ کے مسلمانوں میں سے تھے دمشق میں مسلمانوں کے پاس مال و دولت کی کثرت دیکھ کر ان کی طبیعت میں ایک خاص جوش پیدا ہوا۔ اور انہوں نے یہ وعظ کرنا شروع کیا کہ مال و دولت صرف

ابوذر

خدا کے رستے میں خرچ کرنے کیلئے ہی جمع رکھنے کیلئے نہیں اور آہستہ آہستہ اس بارے میں ان کو یہاں تک غلو ہوا کہ ایسے لوگوں کو جنکے پاس مال و دولت جمع ہو آیت قرآنی الذین یکنزون الذھب والفضۃ کا مصداق قرار دیتے یعنی اُن لوگوں کو جہنمی ٹھہراتے۔ اس وعظ سے لوگوں میں ایک عام شورش پیدا ہوتی اور فتنہ بڑھتا اس لئے معاویہ نے انہیں حضرت عثمان کے پاس مدینہ بھیج دیا۔ حضرت عثمان نے انہیں بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی کہ مال میں زکوٰۃ تو وہ حق ہے جس کے لئے لوگوں کو مجبور کیا جا سکتا ہے۔ مگر سارا مال خدا کے رستہ میں دینے کے لئے کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور چونکہ مدینہ میں بھی اس وعظ سے فتنہ پیدا ہوتا تھا حضرت عثمان نے محض فتنہ کے سدباب کے لئے انہیں ربذہ میں بھیج دیا جہاں دو سال بعد ان کا انتقال ہوا۔ حضرت عثمان کے خلاف منصوبہ بازوں نے جو کچھ باتیں عام لوگوں کو سنا کر دھوکا دیا ان میں سے ایک ابوذر کو اس طرح علیحدہ کرنا بھی تھا حالانکہ حضرت عثمان نے اُن سے کوئی خاص سختی بھی نہیں کی۔ صرف فتنہ کے سدباب کے لئے انہیں علیحدہ مقام پر بھیج دیا تھا۔

قرآن کریم کے مستند نسخے

اسلام اس وقت مشرق و مغرب میں سینکڑوں میلوں تک پھیل چکا تھا۔ اور نئے نئے لوگ اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ خود عرب میں بھی بعض اقوام کے لہجہ اور تلفظ میں فرق تھا۔ جس سے قرأتوں کا اختلاف پیدا ہو گیا تھا یعنی بعض صورتوں میں ایک شخص ایک لفظ کو ایک طرح ادا کرتا تو دوسرا دوسری طرح اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے عرب میں تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے یہ اجازت خود دی تھی لیکن غیر عرب لوگوں کے لئے یہ ضرورت نہ تھی اُن کے لئے جس طرح ایک قرأت کا ادا کرنا مشکل تھا ویسا ہی دوسری قرأت کا۔ اور خود عرب میں بھی یہ ایک عارضی اجازت تھی جو صرف الفاظ کے خاص طور پر ادا کرنے کے لئے دے دی گئی تھی۔ قرآن کریم کی تحریر صرف ایک ہی طرز پر تھی اور اصل وہی تھی۔ مگر دقت یہ تھی کہ گو حافظ ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے مگر تحریر میں قرآن کریم کا صرف ایک ہی مستند نسخہ تھا جو مدینہ میں حضرت حفصہ کے پاس تھا۔ یعنی وہی نسخہ جو حضرت ابوبکر نے جمع کرایا تھا اور باقی نسخے مکمل یا غیر مکمل جس قدر تھے وہ مستند نہ تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ بعض لوگوں نے ان قراتوں کو جن کی اجازت محض تلفظ کی مشکلات کی وجہ سے دے دی گئی تھی۔ تحریر میں لانا شروع کر دیا تھا۔ اور مختلف درسگاہوں میں جہاں قرآن شریف کی تعلیم دی جاتی تھی (جیسا کہ حضرت عمر کے حالات میں گذر چکا ہے) ایک جگہ کے لوگ ایک قرات پر قرآن شریف کو پڑھتے تو دوسری جگہ کے لوگ دوسری قرآت پر پڑھتے اور اس طرح بظاہر ایک اختلاف نظر آتا۔ دوسری دقت یہ تھی کہ تعلیم اسلام کے بیرونی مرکزوں میں کوئی مستند نسخے قرآن شریف کے موجود نہ تھے۔ جن سے بوقت ضرورت مقابلہ کر کے غلطی کو درست کیا جا سکے۔ حذیفہ نے حضرت عثمان سے یہ شکایت کی آپ نے اجلہ صحابہ کو بلا کر مشورہ کیا اور اتفاق رائے سے یہ قرار پایا کہ قرآن کریم کے اس نسخہ کی جو حضرت حفصہ کے پاس ہے نقلیں کرا کر مختلف مقامات پر رکھوائی جائیں۔ اور آیندہ قرآن شریف کا جو نسخہ لکھا جائے۔ وہ انہیں مستند نسخوں سے لکھا جائے اس غرض کی تکمیل کے لئے صحابہ کی ایک جماعت مقرر کی گئی۔ اور چار نسخے تیار کرا کر ان میں سے ایک نسخہ مکہ میں ایک مدنیہ میں۔ ایک کوفہ میں اور ایک دمشق میں رکھوایا گیا۔ اور اس سے پہلے جو نسخے لوگوں نے اپنے طور پر لکھے ہوئے تھے اور جن پر صحت کا پورا اعتماد نہ کیا جا سکتا تھا۔ ان سب کو جلوا دیا گیا۔ یہ کام حضرت عثمان نے اپنی رائے سے نہ کیا تھا بلکہ سب صحابہ کا اس پر اتفاق تھا۔ اور فی الحقیقت انہوں نے رسول اللہ صلعم کے اصل منشا کو ہی پورا کیا تھا کیونکہ باوجود عرب کی مختلف اقوام کو یہ اجازت دینے کے کہ وہ ایک لفظ کو اپنے لہجہ میں ادا کر لیں۔ تحریر میں ایک ہی نسخہ تھا۔ اور قرآن شریف کو مختلف قراتوں پر نہیں لکھوایا گیا تھا۔ اور قرآن شریف کا کسی اور قرآت پر لکھا جانا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عمل کے خلاف تھا۔ اسی لئے سب صحابہ کا اس بات پر اتفاق تھا کہ جو نسخے لوگوں نے خود بخود لکھ لئے ہیں اور جن میں کسی دوسری قرآت کے لکھا جانے کا احتمال تھا۔ ان سب کو جلوا دیا گیا۔ لیکن جب شریر لوگوں نے حضرت عثمان کے خلاف منصوبہ بازی شروع کی تو ایک اچھی بات کو بھی غلط پیرائے میں بیان کر کے لوگوں کو اشتعال دینا شروع کیا۔ کہ دیکھو حضرت عثمان نے قرآن کریم کے نسخوں کو جلوا کر ان کی ہتک کی ہے۔ اور ان ناواقف لوگوں پر جو مدینہ سے دور پڑے ہوئے تھے ان باتوں کا اثر ہو جاتا تھا۔

سنہ ۳۳ و ۳۴ھ
۶۵۴-۶۵۵ء

چنانچہ ابن سبا نے علاوہ مصر کے جہاں وہ اپنی شرارت اور منصوبہ بازی کا مرکز قایم کرچکا تھا۔ بصرہ اور کوفہ میں بھی اپنے خیالات کے کچھ حامی اس طرح پرپیدا کرلئے تھے۔ یہ لوگ جو فساد کے سرغنے تھے اصل میں شریر لوگ تھے جو ابن سبا کے منصوبہ میں شامل تھے۔ مدینہ میں صرف دو آدمی ایسے تھے جنہوں نے اس سازش میں حصہ لیا۔ ایک محمد بن ابو بکر دوسرے محمد بن ابی حذیفہ یہ دونوں نوجوان عبداللہ بن سعد بن ابی سرح گورنر مصر کے ساتھ لڑ کر آئے تھے اور اب جو ابن سبا نے اپنا جال مصر میں پھیلانا شروع کیا تو وہ بھی اس کے دام میں آ گئے۔ اور اس کے ساتھ مل گئے۔ کوفہ میں جو لوگ اس شرارت کے سرغنے تھے وہ حضرت عثمان اور آپ کے عمال کی بدگوئی خفیہ طور پر تو کرتے ہی تھے۔

آغاز شرارت

اب وہ علی الاعلان فساد کے موقعہ کی تلاش میں تھے۔ ان ایام میں گورنر کے پاس ہر قسم کے لوگوں کی رسائی ہونے کے علاوہ گورنر عام مجالس بھی منعقد کیا کرتے تھے جن میں ہر قسم کے آدمی ہوتے تھے۔ اور ہر قسم کی بات چیت ہوسکتی تھی۔ یہ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں اس مساوات اور آزادی رائے کا نتیجہ تھا۔ جو اسلام نے پیدا کی تھی ایسی ہی ایک مجلس قایم تھی کسی ذکر میں ایک نوجوان نے یہ کہدیا کہ اگر فلاں زمین گورنر کے پاس ہو تو کیا اچھا ہو۔ مطلب یہ تھا کہ پھر وہ بھی زیادہ داد و دہش کرسکتا ہے اس پر اس منصوبہ باز گروہ نے جو مجلس میں موجود تھا موقعہ دیکھ کر اس نوجوان پر حملہ کیا۔ کہ تم ہماری زمینوں پر دوسروں کو دیکھنا چاہتے ہو اور قریب تھا کہ اسے اور اس کیساتھ ہی اسکے والد کو بھی مار ڈالتے۔ چونکہ یہ صاف نظر آتا تھا کہ یہ ایک فساد نہیں بلکہ اس کی اصل غرض حضرت عثمان اور اُن کے عمال کو بدنام کرنا ہے۔ اس لئے ان امور کی اطلاع حضرت عثمان کو دی گئی اور آپ نے اُن کو شام میں جلاوطن کرنے کا حکم دیا۔ آپ کی غرض صرف اس قدر تھی کہ وہاں معاویہ اُن کی اصلاح کی تدابیر کرلیں گے یہ جلاوطنی کا حکم دس آدمیوں کے لئے تھا جن میں اشتر بھی تھا۔ معاویہ نے ان لوگوں کو بہتیرا سمجھایا۔ کہ تم خواہ مخواہ فساد نہ کرو مگر انہوں نے معاویہ کی بھی پروا نہ کی۔ تب انہیں دوسرے مقام پر بھیج دیا گیا۔ اور وہاں کے حاکم نے اُن کو نظربندی کی حالت میں رکھا۔ اسی اثنا میں سعید گورنر کوفہ خود بعض معاملات کو حضرت عثمان کی خدمت میں عرض کرنے کے لئے مدینہ

گئے ان کی غیر حاضری کو شر انگیز گروہ نے غنیمت سمجھا۔ اور جلا وطن شدہ گروہ کو واپس بلا کر عام مخالفت شروع کر دی۔ یہاں تک کہ جب سعید صرف ایک نوکر کے ساتھ مدینہ سے واپس آ رہے تھے تو ان لوگوں نے اُن کا مقابلہ کیا۔ نوکر کو مار ڈالا اور کہا کہ ہم تم کو کبھی کوفہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ چنانچہ سعید واپس ہو گیا۔ حضرت عثمان کا حلم جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ ان لوگوں سے کسی قسم کی سختی نہ کرنا چاہتے تھے ایسے موقعہ پر جہاں علانیہ ایک بغاوت کی صورت اختیار کر کے گورنر کو نکال دیا گیا تھا بجائے سرغنوں کو سخت سزا دے کر اس فساد کو دبانے کے انہوں نے اور بھی نرمی اختیار کی۔ اور بجائے سعید کے ابو موسیٰ اشعری کو گورنر کوفہ کر کے بھیج دیا۔ ابو موسیٰ نے کوفہ پہنچ کر سب لوگوں سے خلیفہ کی اطاعت کی حلف لی۔ مگر شرارت کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔

سنہ ۳۴-۳۵ھ
۶۵۵-۶۵۶ء

مفسدوں کا اثر آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ مفسدوں کے ہاتھ میں سب سے زبردست

شکایتوں کی تحقیقات اور گورنروں کی کانفرنس

ہتھیار حضرت عثمان کے گورنروں کو بدنام کرنا تھا۔ اور یہ ایک ایسا امر تھا جس میں عام ناواقف مسلمان جلد غلطی بھی کھا جاتے تھے۔ مدینہ میں بھی یہ باتیں عام ہونے لگیں اور چونکہ بصرہ کوفہ۔ مصر تینوں طرفوں سے شکایتوں کا فرضی طومار ایک منصوبہ بازی کے ماتحت شروع تھا۔ اور تحقیقات کا موقعہ لوگوں کو مل نہ سکتا تھا اس لئے بعض صحابہ کے دل میں بھی یہ خیال گذرا کہ حضرت عثمان غلطی کر رہے ہیں اور جب آپ کے پاس شکایت کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ مجھے جو اطلاع آتی ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ گورنروں کے کام میں کوئی نقص نہیں۔ آخر مشورہ سے یہ قرار پایا کہ بصرہ کوفہ دمشق اور مصر میں ایک ایک معتبر آدمی تحقیقات کے لئے بھیجا جائے۔ اس تحقیقات کے لئے عبد اللہ بن عمر۔ اسامہ بن زید۔ محمد بن مسلم۔ اور عمار بن یاسر کو مقرر کیا گیا۔ ان میں سے عمار بن یاسر مصر گئے اور وہ وہاں ابن سبا کے ساتھیوں کے دھوکہ میں ایسے آئے کہ خود بھی واپس نہیں آئے۔ اس کی خاص وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح کے متعلق جو مصر کے گورنر تھے بہت لوگوں کے خیالات اچھے نہ تھے اور عمار نے اپنی سادگی کی وجہ سے منصوبہ بازوں کی ہر ایک بات پر یقین کر لیا۔ لیکن باقی تینوں مقامات پر یعنی بصرہ کوفہ اور

دمشق میں جو آدمی بھیجے گئے تھے وہ بے لاگ اور پایہ کے آدمی تھے انہوں نے بعد تحقیقات گورنروں کے مظالم کی کہانیوں کو از سرتاپا جھوٹا پایا۔ اور اسی کے مطابق آکر دربار خلافت میں رپورٹ کی۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عثمان نے تمام اطراف ملک میں یہ پیغام بھیجا کہ آئندہ حج کے موقعہ پر سب گورنر حاضر ہونگے۔ جس جس جگہ کسی شخص کو اُن کے خلاف کوئی شکایت ہے تو وہ اس موقعہ پر حاضر ہو کر اپنی شکایت بیان کرے۔ ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس سے زیادہ شکایات کے سدباب کے لئے اگر واقعی کوئی صحیح شکایات تھیں آپ کچھ نہ کر سکتے تھے معتبر آدمی بھیج کر تحقیقات کر لی گئی اور پھر لوگوں کو عام اعلان کے ذریعے سے اطلاع دے دی گئی کہ اجتماع حج کے بعد جب سب گورنر موجود ہونگے۔ جو شخص چاہے اپنی شکایات پیش کرے۔ حج کا موقعہ آیا اور سب گورنر حاضر ہوئے۔ مگر شکایت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ فی الحقیقت بات وہی سچ تھی جو تحقیقات کرنے والوں نے بھی بیان کی تھی۔ کہ کوئی ظلم کسی جگہ بھی نہیں ہو رہا۔ آخر حضرت عثمان نے گورنروں اور دیگر لوگوں سے مشورہ کیا کہ اس منصوبہ بازی اور شرارت کا سدباب کس طرح کیا جائے لیکن جو رائے آپ کو دی گئی وہ یہی تھی کہ سرغنوں کو کوئی سخت سزا دی جائے۔ اور اس پر حضرت عثمان راضی نہ ہوتے تھے۔ کسی مسلمان کی خونریزی یا مسلمانوں کے اندر فساد وہ دیکھنا نہ چاہتے تھے۔ اس لئے کانفرنس سے بھی شرارت کا سدباب کچھ نہ ہوا۔ چلتے وقت حضرت معاویہ نے حضرت عثمان سے عرض کیا کہ شرارت ترقی پر ہے۔ یا تو آپ مجھے اجازت دیں کہ کچھ فوج آپ کی حفاظت کے لئے بھیج دوں۔ اور یا آپ دمشق چلے چلیں۔ مگر حضرت عثمان نے ان دونوں باتوں کو بھی نامنظور کیا۔ اور کہا کہ میں اس مقام کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں جہاں رسول اللہ صلعم مدفون ہیں۔ اور فوج کا بوجھ اپنی جان کی حفاظت کے لئے میں بیت المال پر نہیں ڈالتا۔

مفسدوں کا مدینہ پر حملہ

شوال ۳۵ھ — اپریل ۶۵۶ء

ادھر گورنر مدینہ میں جمع تھے ادھر مفسدوں نے پہلے سے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ ان کی غیر حاضری میں ہر جگہ سے آدمیوں کی کافی تعداد ساتھ لے کر بصرہ اور کوفہ اور مصر کے قافلے ایک ہی وقت مدینہ پہنچیں اور حضرت عثمان کو گورنروں کے موقوف کرنے کے لئے مجبور کریں۔ اور اگر رضامند نہ ہوں تو اُن سے خلافت سے دست برداری کا

مطالبہ کیا جائے۔ اور اگر وہ خوشی سے خلافت سے الگ نہ ہوں تو پھر تلوار سے کام لیا جائے مگر ادھر یہ پوری تیاری نہ کر چکے تھے کہ گورنر واپس پہنچ گئے۔ اس لئے اس وقت یہ تجویز رک گئی۔ اگلے سال یعنی ۳۵ھ ہجری شوال کے مہینے میں (مارچ ۶۵۶ء عیسوی) اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ اور حج کے بہانے سے مختلف قافلے بصرہ اور کوفہ اور مصر سے ایک ہی وقت میں روانہ ہوئے اور مدینہ پہنچ کر الگ الگ مقامات پر خیمہ زن ہوئے۔ حضرت عثمان کو جب ان مفسدوں کے آنے کی خبر ملی تو آپ نے منبر پر چڑھ کر بیان کیا کہ یہ لوگ میرا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر یہ مجھ پر ہاتھ اُٹھائیں گے تو مسلمانوں میں ایک ایسی فساد کی آگ بھڑک اُٹھے گی کہ یہ خود اپنی اس کارروائی پر افسوس کریں گے چونکہ اہالیٔ مدینہ کو اُن کے آنے کا قبل از وقت علم ہو گیا تھا۔ اس لئے ادھر سے بھی لوگ ہتھیار بند ہو گئے اور مقابلہ کی آمادگی ظاہر کی۔ اُن لوگوں کو جب اس حال کا علم ہوا تو گھبرائے کیونکہ اُن کا یہ خیال تھا کہ مدینہ کے لوگ بھی حضرت عثمان سے خوش نہیں۔ اب سرغنوں نے یہ تجویز سوچی کہ اپنا مطلب کسی اور طریق سے حاصل کیا جائے غرض ان کی یہ تھی کہ ایک دفعہ مدینہ کے اندر داخل ہو جائیں۔ پھر اہل مدینہ مقابلہ کرنے کے قابل نہ رہیں گے۔ اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چنانچہ اول ان کا ایک وفد ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہا کہ ہماری غرض اور کچھ نہیں۔ صرف حضرت عثمان کے سامنے بعض گورنروں کی شکایات پیش کریں گے اور ان کی تبدیلی کی درخواست کریں گے انہوں نے کہا یہ تمہاری بات قابل قبول نہیں۔ اور ظاہر بھی تھا کہ شکایات کے پیش کرنے کے لئے ایک وقت تینوں مقامات سے کس طرح یہ لوگ جمع ہو گئے۔ سازش صاف نظر آتی تھی وہاں سے ناکام ہو کر حضرت علی کے پاس گئے۔ جو ابن سبا کی تجویز کے مطابق رسول اللہ صلعم کے وصی تھے۔ انہوں نے خیال کیا کہ وہ ہمارا ساتھ دیں گے۔ مگر وہ خود ان مفسدوں کے مقابلہ کے لئے تیار تھے اور ان کو دھتکار کر نکال دیا اسی طرح اہل کوفہ زبیر کے پاس پہنچے اور وہی مقصد ظاہر کیا اور اہل بصرہ طلحہ کے پاس پہنچے لیکن ان دونوں نے بھی انکو وہی جواب دیا جو حضرت علی نے دیا تھا چونکہ اہل بصرہ حضرت عثمان کے بعد طلحہ کی خلافت کو چاہتے تھے اور اہل کوفہ زبیر کی اس لئے انہوں نے سمجھا کہ یہ لوگ بھی

ہمارے ساتھ ہونگے مگر یہ بزرگ صحابہ ایسے خیال پر لعنت بھیجتے تھے۔ کہ ایسے مفسدوں کے ساتھ ہو کر ایک ایسا ذلیل کام کریں۔ جب سب طرف سے ناکام ہوئے تو اب انہوں نے دوسری طرح مطلب نکالنے کی کوشش کی اور بظاہر اپنے فعل پر اظہار ندامت کر کے صرف یہ درخواست کی کہ مصر کا والی بدل دیا جائے اور اس کی جگہ محمد بن ابو بکر کو مقرر کر دیا جائے حضرت عثمانؓ نے اُن کی اس درخواست کو قبول کر لیا اور محمد بن ابی بکر کے تقرر کا پروانہ اُن کو دے دیا۔ اور یہ تینوں گروہ بظاہر خوش ہو کر واپس چلے گئے۔

جعلی خط اور مدینہ میں داخلہ

جب مفسد واپس ہو گئے تو اہل مدینہ خوش ہوئے کہ فساد رفع ہو گیا۔ اور وہ سب اطمینان سے اپنے کاروبار میں لگ گئے مگر ابھی چند دن ہی گذرے تھے کہ اچانک تینوں گروہ پھر آموجود ہوئے اور اہل شہر کی بے خبری کی حالت میں مدینہ میں داخل ہو گئے حضرت علیؓ چند آدمیوں کو ساتھ لیکر اُن سے ملے اور وجہ دریافت کی تو انہوں نے والی مصر کے نام کا ایک خط دکھایا جس پر بظاہر حضرت عثمانؓ کی مہر تھی اور جس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ جب یہ مفسد لوگ مصر میں واپس پہنچیں تو اُن کو قتل کر دو یا یہ سزا دو۔ اور اپنی معزولی کا حکم غلط سمجھو۔ حضرت علیؓ فوراً اصلیت کو تاڑ گئے۔ اور اُن سے دریافت کیا کہ یہ کس طرح ہوا۔ کہ اس خط کا قاصد تو مصر کے رستہ پر جا رہا تھا اور اس خط کو سُنکر تم تینوں گروہ یعنی اہل بصرہ اہل کوفہ اور اہل مصر اکٹھے واپس آ گئے ہو۔ کیونکہ بصرہ کا راستہ اور تھا کوفہ کا اور اور مصر کا اور۔ جہاں خط کا ملنا بتایا جاتا تھا وہ جگہ مدینہ سے اس قدر فاصلہ پر تھی کہ اتنی جلدی وہ ایک دوسرے کو اطلاع دیکر واپس نہ آسکتے تھے اصل بات یہ تھی کہ ان مفسدوں نے جب اہل مدینہ کی تیاری کی وجہ سے اپنے آپ کو اس قابل نہ پایا کہ مدینہ میں داخل ہو سکیں تو یہ سازش کی کہ سردست یہاں سے چلے جائیں۔ تاکہ اہل مدینہ غافل ہو جائیں۔ اور پھر کوئی بہانہ بنا کر واپس آئیں۔ اسی بہانہ کے لئے یہ جعلی خط بنایا گیا۔ اگر یہ خط اصلی ہوتا تو اہل مصر تو اسے لیکر واپس مدینہ پہنچ سکتے تھے۔ مگر باقی دو گروہ یعنی اہل بصرہ اور اہل کوفہ کی اول تو واپس آنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور ہوتی بھی تو مدینہ پہنچ کر ہی اُن کے پیچھے قاصد بھیجا جا سکتا تھا۔ اور اس وقت تک وہ شاید بصرہ اور کوفہ پہنچ چکے ہوتے۔ یہ جعل تینوں گروہوں کے سرغنوں

نے مشورہ سے پہلے سے تجویز کیا تھا اور اسی سازش کے مطابق ایک ہی وقت اپنے اپنے رستوں سے یہ تینوں واپس آگئے کہا جاتا ہے کہ اس پر حضرت عثمان کی مہر تھی لیکن کیا مہر جعلی نہ بن سکتی تھی۔ حضرت عثمان کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو آپ نے جو جواب دیا اس میں یہی اشارہ تھا کہ مہر جعلی بن سکتی ہے۔ رہا یہ کہ حضرت عثمان کا نوکر یہ خط لے جارہا تھا یہ بھی ان مفسدوں کا جھوٹ تھا۔ اگر یہ بات تھی تو انہیں حضرت عثمان کے اس نوکر کو پیش کرنا چاہئے تھا کہ سب صحابہ اُن کے دعوے کی صداقت کے قائل ہو جاتے۔ مگر باوجود حضرت عثمان کے اس مطالبہ کے کہ گواہ پیش کئے جائیں یہ لوگ کوئی گواہ پیش نہیں کرسکے۔ بعض لوگوں کا خیال ہوا کہ مروان نے خط لکھا ہوگا لیکن ایسی صورت ہوتی تو بھی اس ایک ملازم کے پیش کردینے سے سب حقیقت کھل جاتی اور بات بالکل صاف ہو جاتی مگر کسی بھی شہادت کا پیش نہ کرنا صاف بتاتا ہے کہ یہ محض جعل تھا۔ غرض حضرت علی نے جب یہ اعتراض کیا کہ اگر خط مصر کے رستے پر جارہا تھا تو تم تینوں گروہ اکٹھے کس طرح واپس آگئے۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور صرف یہی کہا کہ خلیفہ کی مہر اس پر موجود ہے۔ آپ جو چاہیں سمجھیں۔ پھر حضرت علی انہیں حضرت عثمان کے پاس لے گئے وہاں وہ نہایت گستاخی سے پیش آئے خط کے پیش کیا جانے پر حضرت عثمان نے قسم کھا کر کہا۔ کہ نہ میں نے یہ خط لکھا نہ مجھے اس کا کوئی علم ہے۔ تب انہوں نے کہا کہ پھر یہ مہر کس طرح لگی آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کا علم نہیں۔ حضرت عثمان جیسے راست باز کا حلف اٹھانا ایک طرف اور کسی شہادت کا نہ ہونا دوسری طرف اس بات کا قطعی ثبوت تھا کہ کم از کم اس میں حضرت عثمان کا کوئی قصور نہیں۔ مگر ان کی نیت تو کچھ اور تھی نہایت گستاخی سے کہا کہ اگر یہ خط آپ نے لکھا ہے تو بھی آپ خلافت کے اہل نہیں۔ اور اگر کسی اور نے لکھا ہے یعنی دوسرا بھی امور سلطنت میں اس طرح دست اندازی کرسکتا ہے تو بھی آپ خلافت کے اہل نہیں۔ اس لئے آپ خلافت سے دست بردار ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ جو خلعت خدا نے مجھے پہنایا ہے اسے میں پھینک نہیں سکتا۔ اگر تم میری غلطی بتاؤ تو اس کی اصلاح کے لئے تیار ہوں۔ انہوں نے کہا اب یہ وقت نہیں رہا۔ اب دو باتوں میں سے ایک بات ہوگی۔ یا تو آپ دست بردار ہو جائیں یا ہم جنگ کرینگے

یہاں تک کہ آپ کو دست برداری پر مجبور کر دیں یا آپ کا فیصلہ کر دیں آپ نے فرمایا موت سے میں خوف نہیں کرتا۔ اور اسے سہل سمجھتا ہوں۔ رہا جنگ کرنا اگر میں اس بات کیلئے تیار ہوتا تو آج ہزاروں آدمی یہاں میرے پاس ہوتے۔ اور میری طرف سے لڑنے کو تیار ہوتے۔ مگر میں اس بات کے لئے تیار نہیں کہ مسلمانوں میں خونریزی کا موجب بنوں۔ ان باتوں کے بعد مفسد اُٹھ کھڑے ہوئے۔

مفسدوں کی باغیانہ حرکات اور حضرت عثمان پر زیادتی

شہر پر باغیوں کا قبضہ تھا اور صحابہ اور دیگر اہل مدینہ مع حضرت عثمان کے گویا اُن کے قبضہ میں تھے یہ لوگ مسجدیں نمازوں میں بھی آتے جاتے تھے ایک دفعہ حضرت عثمان نے کچھ بولنا چاہا تو انہوں نے آپ کے منہ پر مٹی پھینکی اور آپ کے ساتھیوں کو ہٹا دیا۔ سرغنے حضرت عثمان کو عوام الناس کے سامنے کوئی بات کرنے کا موقعہ نہ دیتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر ان کے ساتھیوں پر اصلیت ظاہر ہوگئی تو سب کام بگڑ جائیگا۔ جمعہ کا دن آیا تو حضرت عثمان بعد نماز منبر پر چڑھے اور باغیوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم لوگ جانتے ہو کہ تم پر رسول اللہ صلعم نے سخت لعنت کی ہے تم توبہ کرو۔ اور ان حرکات سے باز آجاؤ۔ یہ اس پیشگوئی کی طرف اشارہ تھا جو حضرت علی اور طلحہ اور زبیر ان لوگوں کو ان کی پہلی آمد کے موقعہ پر بتا چکے تھے۔ یعنی جن جن مقامات پر اُن لوگوں نے ڈیرہ لگایا تھا۔ ان مقامات کا نام لے کر آنحضرت صلعم نے فرمایا تھا کہ ان جگہوں پر ڈیرہ لگانے والے لشکروں پر لعنت ہے۔ حضرت عثمان نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ ان لوگوں نے مسجد میں شور برپا کر دیا۔ بعض بڑے بڑے صحابی یعنی زید بن ثابت اور محمد بن مسلم حضرت عثمان کی بات کی تائید کے لئے اُٹھے۔ مگر ان شریروں نے انہیں پکڑ کر بٹھا دیا اور ساتھ ہی صحابہ پر اور اہل مدینہ پر پتھر برسانے شروع کئے۔ اور اس طرح انہیں مسجد سے نکال دیا۔ ایک بدمعاش نے حضرت عثمان کے ہاتھ سے عصا چھین کر توڑ ڈالا۔ اور پتھروں کی بوچھاڑ سے زخمی ہو کر آپ گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے اور لوگ آپ کو اٹھا کر گھر لے گئے اس کے بعد حضرت عثمان کا مسجد میں آنا روک دیا گیا اور آپ کے گھر کو محصور کر لیا گیا۔ لیکن حضرت علی اور طلحہ اور زبیر نے اپنے اپنے فرزندوں کو آپ کے گھر کے دروازہ پر مسلح کر کے بٹھا دیا تا کہ مفسد

اندر گھسنے نہ پائیں اور ایک چھوٹی سی جماعت اہل مدینہ کی آپ کے دروازہ پر رہتی تھی بعض بھی اہل مدینہ کے اپنے خلاف اس اتفاق سے گھبراتے تھے اور کشت و خون تک نوبت پہنچانے سے خائف تھے۔ لیکن حضرت عثمان کے گھر کے محاصرہ میں یہاں تک سختی کی نوبت پہنچی کہ ایک دفعہ آپ کے گھر میں پانی جانا بھی بند کر دیا۔ حضرت علی نے اُن کو سمجھایا کہ جو سلوک وہ خلیفہ وقت سے کر رہے ہیں وہ تو ایک کافر دشمن سے بھی جائز نہیں۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ آخر حضرت ام حبیبہ نے خود ایک خچر پر سوار ہو کر حضرت عثمان کو پانی پہنچانا چاہا مگر ان بدمعاشوں نے ام المومنین کا بھی لحاظ نہ کیا۔ اور ایسی گستاخی سے پیش آئے کہ قریب تھا کہ آپ گر پڑتیں۔

مسلمان تلوار اٹھانے میں پہل نہ کرتے تھے۔

ان واقعات پر ایک سوال فوراً ہر دل میں اُٹھے گا کہ اہل مدینہ جن میں حضرت علی، طلحہ اور زبیر جیسے حضرات موجود تھے باغیوں کی ان سب حرکات پر خاموش کیوں تھے۔ اور ان امور کا کچھ انسداد کیوں نہ کرتے تھے۔ کیا اُن کا فرض نہ تھا کہ حضرت عثمان کی حفاظت کیلئے اپنی جانیں قربان کر دیتے؟ اسکی اصل وجہ کو نہ جاننے کی وجہ سے بہت سے مورخین کو بھی ٹھوکر لگی ہے اور وہ خیال کرتے ہیں کہ گو حضرت علی طلحہ زبیر جیسے انسان باغیوں کے ساتھ نہ تھے اور نہ ان مفسدوں کی سازش میں شامل تھے۔ لیکن انہوں نے خاموش بیٹھ کر حضرت عثمان کی شہادت کو ضرور دیکھا۔ گویا حضرت عثمان سے بھی وہ خوش نہ تھے اور اس لئے خاموش بیٹھے دیکھتے تھے کہ جو ہونا ہے سو ہو جاتے۔ یہ بالکل خلاف واقعات ہے۔ اصل حالت یہ تھی کہ باغی مدینہ پر قابض ہو چکے تھے اور اہل شہر بالکل دب چکے تھے۔ اور باغی مدینہ پر متصرف ہونے کی وجہ سے جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ دوسرا سوال حضرت عثمان پر جانیں فدا کرنیکا۔ جہاں تک ہو سکتا تھا ایک جماعت اہل مدینہ کی اس غرض کے لئے مسلح ہو کر حضرت عثمان کے دروازہ پر بیٹھ گئی تھی جس میں حضرت علی طلحہ اور زبیر کے بیٹے موجود تھے اور یہ لوگ جانیں فدا کرنے کے لئے ہی وہاں بیٹھے تھے مگر وہ باغیوں پر ہاتھ اس لئے نہ اُٹھاتے تھے کہ اب تک باغیوں نے کشت و خون تک نوبت نہ پہنچائی تھی ایسے رہائش میں تلوار چلانے

کے حضرت عثمان خود مخالف تھے۔ اور اہل مدینہ کا فرض تھا کہ خلیفۂ وقت کے حکم سے انحراف نہ کریں۔ جب انہوں نے علی الاعلان سب لوگوں کو مفسدوں پر تلوار اٹھانے سے روک دیا۔ اور تاکیدی حکم اس بارہ میں دے دیا کہ کوئی مسلمان ان لوگوں پر تلوار نہ اٹھائے تو اب کیا چارہ تھا۔ ماسوا اس کے خود اہل مدینہ کا بھی یہی خیال تھا کہ ان لوگوں پر جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تلوار نہیں اٹھائی جا سکتی۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم ہی چونکہ یہ امر داخل ہو چکا تھا کہ کفار پر بھی تلوار اٹھانے میں پہل نہیں کی جا سکتی اس لئے وہ مسلمانوں پر تلوار اٹھانے میں پہل کرنے کے خلاف تھے۔ اور مفسدوں کی سب زیادتیوں کو برداشت کر رہے تھے مگر تلوار نہ اٹھاتے تھے ہاں اس امر کیلئے تیار تھے کہ اگر مفسد پہلے تلوار اٹھائیں تو پھر ان کا جواب تلوار سے دیں۔ اور حضرت عثمان پر اپنی جانوں کو فدا کر دیں۔ دوسری طرف مفسد بھی تلوار اٹھانے کی جرات نہ کرتے تھے اس لئے کہ گو چند سرغنے بدمعاش بھی تھے مگر عام لوگ جو ساتھ ہو گئے تھے وہ محض دھوکے میں تھے۔ اور ان کو اس بات پر راضی نہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ مسلمانوں پر تلوار اٹھانے میں پہل کریں۔ پس نہ مفسد تلوار اٹھاتے تھے نہ اہل مدینہ۔ اور یہی وجہ تھی کہ مفسد صرف اپنے دباؤ سے کام نکالنا چاہتے تھے۔ اور اہل مدینہ بھی خاموش تھے اور انہیں یہ خیال نہ تھا کہ باوجود اپنی ساری دھمکیوں کے مفسد حضرت عثمان کا کیا کسی مسلمان کا خون گرانے کی جرات کریں گے۔ حضرت عثمان کی زندگی کے یہ واقعات اس بات کی صاف شہادت ہیں کہ مسلمان کسی قوم پر تلوار اٹھانے میں پہل نہ کرتے تھے اور یہی قرآن کریم کی صریح تعلیم ان کو تھی۔

حضرت عثمان کا لوگوں کو حج کے لئے روانہ کرنا

یہی حالات تھے کہ حج کا موسم آ گیا۔ حضرت عثمان اس حالت میں بھی اپنے فرائض سے غافل نہ تھے۔ مگر چونکہ آپ کی باہر کی آمد و رفت بند تھی اس لئے کوٹھے کی چھت پر چڑھ کر آپ نے مناسب ہدایات دیں اور حج کے قافلہ پر حضرت ابن عباس کو امیر مقرر کر کے انہیں جانے کا حکم دیا حضرت ابن عباس بھی اُن لوگوں میں سے تھے جو شب و روز حضرت عثمانؓ کے دروازہ پر مسلح رہتے تھے اور نہ چاہتے تھے کہ اس مقدس فرض کو چھوڑ کر جائیں مگر

خلیفۂ وقت کی اطاعت کے لئے بہرحال یہ لوگ حاضر تھے۔ اور بھی بعض لوگ حج کو چلے گئے۔ حضرت عائشہ بھی حج کو گئیں۔ اور انہوں نے چاہا کہ محمد بن ابوبکر کو بھی ساتھ لے جائیں۔ جو مفسدوں کے سرغنوں میں سے ایک تھا مگر اس نے منظور نہ کیا۔ ایسے حالات میں لوگوں کا حج کو نکلنا صاف بتاتا ہے کہ اہل مدینہ بالکل مطمئن تھے کہ مفسد خونریزی نہیں کریں گے۔ دوسری طرف حضرت عثمان نے یہ دیکھکر کہ یہ لوگ اپنے ناجائز مطالبات کو نہیں چھوڑتے ایک طرف حاجیوں کو ایک پیغام بھیجا جس میں یہ بتایا گیا کہ یہ لوگ محض شرارت اور فساد انگیزی پر آمادہ ہیں اور مجھے بدنام کر رہے ہیں۔ حالانکہ میں نے کوئی امر ایسا نہیں کیا جس پر گرفت کی جا سکے اور یہ اب دوسرے لوگوں کو بھی میری اطاعت سے باہر نکلنے کی تحریک کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف مختلف گورنروں کے نام بھی خطوط لکھے کہ ان لوگوں کی شرارت اب حد سے بڑھ گئی ہے۔ اس لئے اس کے انسداد کا انتظام کرنا چاہئے۔ ان خطوط کے لکھنے سے آپ کا منشا صرف اس قدر تھا کہ اگر باہر سے کچھ لوگ آجائیں تو یہ مفسد خود دب جائیں گے اور اپنی شرارت سے باز آجائیں گے۔

۱۸ ذوالحجہ ۳۵ھ / ۱۷ جون ۶۵۶ء

حضرت عثمان کی شہادت

ادھر مفسدوں نے جب دیکھا کہ حج کے موقعہ پر ان کی شرارتوں کا علم عام لوگوں کو ہو جائیگا اور دوسری طرف باہر سے افواج آجائیں گی۔ اور اس طرح وہ اپنے مقصد میں ناکامیاب ہو جائیں گے۔ اور اس وقت مدینہ بھی قریباً خالی پڑا تھا تو انہوں نے اپنا آخری وار کرنے میں جلدی کی ۱۸۔ ذوالحج ہوگئی تھی اور حج سے واپس ہونے والے لوگ دو چار دن میں پہنچنے والے تھے۔ اہل مدینہ کے مسلح گروہ پر جو حضرت عثمان کے دروازہ پر بیٹھا تھا اُن لوگوں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ جنگ کی نوبت پہنچی مگر جگہ تنگ تھی اور یہ چھوٹی سی جماعت تھی۔ تھوڑی دیر کی جنگ کے بعد یہ محافظ گروہ دروازہ کے اندر ہو گیا۔ اور دروازہ بند کر لیا۔ دروازہ کو توڑنے کی کوشش بھی ناکام ہوئی ادھر اُن مفسدوں نے یہ سوچا کہ کسی دوسرے رستے حضرت عثمان کے گھر میں داخل ہو کر انہیں قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ چند سرغنے ایک ہمسایہ کے گھر کے اوپر سے پھاند کر حضرت عثمان کے اندرونی مکان میں جہاں وہ اپنے اہل کے ساتھ تھے پہنچ گئے

حضرت عثمان اس وقت قرآن شریف کی تلاوت فرما رہے تھے۔ اور کھلا ہوا قرآن شریف آپ کے سامنے تھا پہلے ان کو جرات نہ ہوئی کہ ایک بے گناہ کے خون کا بوجھ اپنے سر پر لیں۔ آخر محمد بن ابوبکر آگے بڑھا اور آپ کی ریش مبارک پکڑ لی۔ حضرت عثمان نے صرف اس قدر کہا کہ میرے بھائی کے بیٹے اگر تیرا باپ زندہ ہوتا تو مجھ سے کبھی ایسا سلوک نہ کرتا محمد بن ابوبکر شرمندہ ہو کر واپس ہو گیا۔ پھر دوسرے بدمعاش بڑھے اور اپنی تلواریں حضرت عثمان پر چلائیں۔ آپ کی بیوی نائلہ جو وہاں موجود تھیں درمیان میں آئیں کہ آپ کو بچائیں ان کی بھی انگلیاں تلوار سے کٹ گئیں چند خدام جو گھر کے اندر تھے انہوں نے مقابلہ کرنا چاہا اور ایک شخص کو قتل بھی کیا مگر یہ لوگ تعداد میں زیادہ تھے آخر زخم کھا کر حضرت عثمان گرے اور آپ کی روح اس جسم خاکی سے پرواز کر کے اپنے مولی سے جا ملی۔ ادہر آپ کی شہادت کی خبر دروازہ پر پہنچی تو لوگ اندر کی طرف دوڑے مگر جو کچھ ہونا تھا ہو چکا تھا دوسری طرف باغیوں کی غرض پوری ہو گئی تھی اب انہوں نے فوراً خزانہ کا رخ کیا مگر بیت المال میں جو کچھ آتا تھا وہ سب مسلمانوں پر تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ آپ کی شہادت کی خبر شہر میں مشہور ہونے پر سب لوگ ششدر رہ گئے۔ مگر شہر باغیوں کے تسلط میں تھا اور سب لوگ اب اور مقابلہ کو فضول سمجھ کر خاموش اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ رہے۔ حضرت عثمان کی لاش بھی تیسرے دن مشکل سے رات کے وقت سپرد خاک ہوئی۔

یہ کہا گیا ہے کہ حضرت عثمان کی کمزوری سے یہ واقعات رونما ہوئے۔ یوں تو کوئی

حضرت عثمان نے اپنے آپ کو اتحاد اسلام پر قربان کیا

انسان غلطی سے خالی نہیں۔ لیکن واقعات تاریخی آپ پر کمزوری کے الزام کو غلط ٹھہراتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کا زمانہ آپ سے پہلی خلافت کی نسبت امن و آسایش کا زمانہ تھا مگر پھر بھی جو جو واقعات اس میں رونما ہوئے آپ نے باوجود پیرانہ سالی کے کمال ہمت دکھائی ایران کی بغاوت آپ کے زمانہ میں فرو ہوئی۔ اور نہ صرف سارا ملک از سر نو مسلمانوں کے قبضہ میں آیا بلکہ اب مزید علاقہ جات کو شامل کر کے حدود کو اور بھی مستحکم کر دیا گیا۔ سکندریہ بھی آپ کے زمانہ میں دوبارہ فتح کیا گیا۔ بحری لڑائیوں کی ابتدا بھی آپ کے زمانہ میں

ہوئی آرمینیا وغیرہ کے علاقجات بھی مسلمانوں کے تصرف میں آئے۔ اگر آپ کمزور ہوتے تو نئی فتوحات تو ایک طرف رہیں۔ اس قدر وسیع ملک کو بغاوت سے بھی صاف نہ کر سکتے۔ مسلمانوں کا قدم آپ کے عہد خلافت میں پیچھے نہ ہٹا بلکہ آگے بڑھا۔ اور سلطنت کو اس قدر استحکام حاصل تھا کہ باوجود بعض مفسدوں کی شرارتوں کے اور باوجود اس کے کہ آپ کے بعد اختلاف رونما ہو گیا۔ سلطنت اسلامی کو ذرا زوال نہیں آیا پس حضرت عثمانؓ پر کمزوری کا الزام صحیح نہیں۔ ان شریروں کے خلاف بھی جنہوں نے آپ کو تباہ کرنے کی ٹھانی ہوئی تھی آپ نے کمزوری نہیں دکھائی۔ مگر وہ مسلمانوں کی زندگی کی حرمت کا خیال تھا جس نے آپ کے ہاتھ کو روک دیا۔ آپ نے اس بات کو قبول کر لیا کہ اپنی جان دے دیں مگر مسلمانوں میں پھوٹ پڑنے کو آپ نے گوارا نہ کیا۔ آپ نے نہ چاہا کہ آپ مسلمانوں سے مسلمانوں پر تلوار چلوائیں اور یوں خلافت اسلامی میں تفرقہ کی بنیاد ڈالیں۔ یوں کہنا چاہیئے کہ آپ نے اپنے آپکو اتحاد اسلام پر قربان کر دیا۔ اور یوں خلافت راشدہ کے اس پہلو کو نمایاں کیا کہ اتحاد اسلام کس قدر زبردست چیز ہے اور مسلمان کو مسلمان پر تلوار اٹھانے میں کس قدر متامل ہونا چاہیئے۔ آج یہی سبق ہے جسے مسلمانوں نے بھلا رکھا ہے۔ اور وہ سب سے پہلے اپنوں کی تباہی کے درپے ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی زندگی اگر رسول اللہ صلعم کے استقلال کے پہلو کو روشن کرنے والی تھی کہ کس طرح چاروں طرف سخت مصائب میں گھر جانے کے باوجود آپ نے ہمت نہیں ہاری اور حضرت عمرؓ کی زندگی اگر رسول خدا صلعم کی زندگی کے دشمنوں پر غلبہ کے پہلو کو روشن کرنے والی تھی (نصرت بالرعب مسیرۃ شھر) تو حضرت عثمانؓ کی زندگی آنحضرت صلعم کی اپنی امت کے لئے محبت کے پہلو کو روشن کرنے والی تھی۔ حضرت عثمانؓ میں حیا کی صفت کا غلبہ وہ چیز ہے جسے خود آنحضرت صلعم نے بھی سراہا اسی صفت حیا کا یہ کامل نمونہ خلافت راشدہ میں بھی ظاہر ہوا خلافت راشدہ درحقیقت آنحضرت صلعم کی زندگی کا ہی ایک حصہ ہے۔ اور اس میں آپکی زندگی کے ہی مختلف پہلو ظاہر ہوتے ہیں اپنی سادگی اور اخلاص میں حضرت عثمانؓ بالکل حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے نقش قدم پر چلے جو کچھ بیت المال میں آتا تھا وہ مسلمانوں کی بہتری پر صرف کرتے جاتے تھے اور خود اس مال و دولت کی طرف جو ان کے وقت میں بافراط آیا آپ نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور یوں اپنے آپ کو خلافت نبوی کا اہل ثابت کیا۔

حضرت علیؓ

۲۴۔ ذوالحج ۳۵ھ ہجری تا ۱۷۔ رمضان ۴۰ھ ہجری

۲۳۔ جون ۶۵۶ء عیسوی تا ۲۵ جنوری ۶۶۱ء عیسوی

۲۴ ذوالحج ۳۵ھ و ۲۳ جون ۶۵۶ء

حضرت علی کا انتخاب

مدینہ میں باغیوں کے داخلہ کے وقت سے ہی حکومت کا تسلط اُٹھ گیا تھا حضرت عثمان کی شہادت کی خبر پر لوگ عموماً اپنے گھروں میں بند رہے اور مدینہ میں ابتری کی صورت تھی۔ باغیوں کے تینوں گروہوں میں سے اہل مصر کا زور زیادہ تھا کیونکہ ابن سبا کی کوششوں کا اصل مرکز مصر ہی تھا۔ انہی کا سردار نماز کی امامت بھی کراتا تھا۔ پانچ دن اسی ابتری کی حالت میں گذر گئے مفسدوں کے تینوں گروہ آیندہ خلیفہ کے متعلق متفق نہ تھے۔ مگر چونکہ اہل مصر کا غلبہ تھا اور ابن سبا حضرت علی کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا وصی کہتا تھا اس لئے اُن کے زور دینے پر حضرت علی کا بحیثیت خلیفہ انتخاب ہوا اور ۲۴ ذوالحج ۳۵ھ ہجری آپ کی بیعت ہوئی اس میں شک نہیں کہ گو اکثر اہل مدینہ نے آپ کی فوراً بیعت کرلی۔ مگر باغیوں کے شہر پر تسلط کی وجہ سے آزادانہ انتخاب کا موقعہ نہ تھا۔ ہاں یہ بھی صحیح ہے کہ اگر آزادانہ انتخاب ہوتا تو بھی حضرت علی ہی منتخب ہوتے اس لئے کہ حضرت عثمان کے انتخاب پر آخری فیصلہ انہی دو بزرگوں میں ہوا تھا اور حضرت عثمان نے حضرت علی کو اور حضرت علی نے حضرت عثمان کو اپنے بعد منصب خلافت کا اہل قرار دیا تھا۔ اور حضرت طلحہ اور زبیر پر باوجود ان کی عظیم الشان خدمات اسلامی کے پہلے بھی حضرت علی کو ترجیح دی گئی تھی باقی بزرگوں میں سے جن پر حضرت عمر کے بعد حضرت عمر اور دوسرے لوگوں کی نظر تھی عبد الرحمٰن تھی جو فوت ہو چکے تھے اور سعد فاتح ایران نے گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی پس باوجود

مدینہ پر باغیوں کے تسلط کے اور آزادی کے نہ ہونے کے حضرت علی کا انتخاب ایسا تھا کہ اس پر کسی شخص کو اعتراض نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہی طلحہ یا زبیر یا معاویہ نے کبھی یہ اعتراض کیا۔ ہاں بعد کے واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ طلحہ اور زبیر نے حضرت علی کی بیعت اپنی خوشی سے نہیں بلکہ اکراہ سے کی۔ اور اس کی وجہ باغیوں کا تسلط تھا جن کی بیخ کنی وہ سب سے پہلے چاہتے تھے۔

حضرت علی کی خلافت کے ساتھ تاریخ اسلام کا ایک نیا باب کھلتا ہے یہ ساڑھے

مسلمانوں کے اختلاف کا زمانہ

چار سال کا زمانہ مسلمانوں کے اختلاف کا زمانہ ہے جس میں بڑے بڑے بزرگوں میں باہم جنگ وجدل تک نوبت پہنچی حضرت عثمان نے مفسدوں کو بارہا یہی لفظ کہے تھے کہ مجھ پر تلوار چلا کر تم مسلمانوں پر ایک ایسی تلوار کھینچ دو گے جو ہمیشہ تک چلتی رہے گی۔ یعنی اسلام میں باب فتنہ وا ہو جائیگا۔ سو ایسا ہی ہوا حضرت عثمان کے زمانہ میں فی الحقیقت مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ ابن سبا کی منافقت نے ایک فساد کھڑا کر دیا تھا جس کے سرغنے اصل میں دشمنان اسلام تھے۔ گو ان کی منافقت سے دوسرے لوگوں کو بھی دھوکا لگا۔ لیکن حضرت علی کی خلافت کے ساتھ ہی مسلمان دو گروہ ہو گئے۔ حضرت علی کو پہلے تین بزرگوں سے کم مشکلات کا سامنا نہ تھا۔ اگر حضرت ابوبکر نے عرب کی بغاوت کی مشکلات میں اور حضرت عمر نے ایران وروما کے ٹڈی دل لشکروں کے مقابلہ میں اور حضرت عثمان نے مفسدوں اور باغیوں کے مقابلہ میں اپنے اپنے عزم واستقلال کا ثبوت دیا۔ تو حضرت علی نے مسلمانوں کے اندرونی فساد واختلاف میں ایسے ہی عزم واستقلال کا نمونہ دکھایا۔ مسلمانوں کا وہ اتحاد جو پہلی دو خلافتوں میں اور حضرت عثمان کے قریباً آخر عمر تک نظر آتا ہے ہمیشہ کے لئے نہ رہ سکتا تھا ایک ایسی امت میں جس کے اندر ہر ملک ہر قوم ہر رنگ ہر زبان کے لوگ داخل ہونے تھے اختلاف کا پیدا ہونا ضروری تھا اس لئے خلافت راشدہ کے زمانہ میں اس کا ایک نمونہ دکھا دیا گیا۔ حالانکہ حضرت علی کے زمانہ کے بعد پھر مسلمانوں کا اتحاد گو اس پہلی حد تک نہ سہی مگر دوبارہ قایم ہو گیا۔ اور ایک لمبے عرصہ تک ایک وسیع حصہ زمین پر مسلمانوں کی

ایک ہی سلطنت رہی۔ جس میں ہر قوم اور ہر ملک کے لوگ شامل تھے ہاں جس طرح پہلی تین خلافتوں کی تاریخ میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے ایک سبق ہے۔ اس اختلاف کی تاریخ میں بھی مسلمانوں کو ایک بیش قیمت سبق ملتا ہے۔ بشرطیکہ فرقی تعصبات کو چھوڑ کر ٹھنڈے دل سے واقعات کا مطالعہ کریں۔ اختلاف دنیا میں ہوگا اختلاف ہو کر لڑائیوں تک نوبت پہنچے گی۔ بھائی کو بھائی کے خلاف بھی کبھی ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کے لئے بھی کوئی نمونہ چاہئے تھا۔ رسول اللہ صلعم تو متفرق اجزا کو اکٹھا کرنے آئے تھے۔ آپ کے زمانے میں اختلاف کا واقع ہونا آپ کے مشن کی اغراض کے منافی تھا۔ آپ کے بعد اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اگر اختلاف وقوع ہوتا قبل اسکے کہ اسلام قوت پکڑ چکا ہوتا اور یہ نازک پودا زمین میں اپنی جڑیں اور آسمان پر اپنی شاخیں پھیلا لیتا تو اسلام کا قیام ہی نہ ہو سکتا۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے چوتھی اور آخری خلافت کو اس غرض کے لئے چنا اور اسلام کی باگ اس اختلاف کے وقت اس شخص کے ہاتھ میں دی جو رسول اللہ صلعم سے نہ صرف ظاہری نسبت ہی کمال تعلق کی رکھتا تھا یعنی وہ نسبت جو فرزندی کے بعد کسی شخص کو میسر آسکتی ہے۔ بلکہ باطنی طور پر بھی آپ کے نور سے منور تھا۔ انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ کا مصداق تھا۔ من کنت مولاہ فعلی مولاہ اس کی شان میں خود زبان مبارک نبوی سے نکل چکا تھا۔ اس ظاہری اور باطنی نسبت کے ساتھ ایک شخص کو اس خطرناک اختلاف میں رحمت بننے کے لئے چن لیا گیا۔ اور اس میں بھی یقیناً اللہ تعالیٰ کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ اس کا وجود تھا جس نے مسلمانوں کے اس اختلاف کو جسے واقعات نیک نیتی کا اختلاف بتاتے ہیں۔ اس حد تک نہ پہنچنے دیا کہ مسلمانوں کی قوت ہی برباد ہو جاتی جیسا آگے چل کر واقعات تاریخی بتائیں گے وہ تلوار اُٹھانے کے بعد بھی رحمت مجسم رہتا تھا۔ اگر ابوبکر و عمر اسلام کی قوت و شوکت کے نمونے ہیں تو عثمان و علی اس کی رحمت اور محبت کے نمونے ہیں۔ ظاہری رنگ میں ابھی اُن دو میں ایک نسبت ہے اور ان دو میں ایک۔ اُن کی صاحبزادیاں رسول اللہ صلعم کے گھر میں ہیں تو رسول اللہ صلعم کی صاحبزادیاں اِن کے گھر میں ہیں۔ ہاں اندرونی اختلاف کے بعد بھی اسلام اپنی ترقی میں نہ رکا۔ اور یوں بتا دیا کہ یہ پودا انسان کا لگایا ہوا نہیں۔ اس خدا کے ہاتھ کا لگایا ہوا ہے جس کے

قبضہ قدرت میں ساری دنیا ہے۔

مفسد جب اپنا کام کر چکے اور حضرت علی کا انتخاب خلافت کیلئے ہو چکا تو وہ سب اپنے اپنے

ملک کی حالت اور قاتلان عثمان کے خلاف قصاص کا شور

مقامات کو روانہ ہوئے۔ اہل بصرہ بصرہ کو اہل کوفہ کوفہ کو اور اہل مصر مصر کو۔ تاکہ اپنی کارروائی کی خبر ان مقامات پر پہنچائیں ادھر حضرت عثمان کی شہادت کی خبر چاروں طرف پھیل گئی۔ بلکہ آپ کے خونی کپڑے اور آپ کی زوجہ محترمہ نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں بعینہٖ دمشق میں معاویہ کے پاس پہنچائی گئیں اور چاروں طرف سے آپ کے خون کے قصاص کی آواز اٹھی اور خود مدینہ کے اردگرد اور مدینہ کے اندر بھی یہی آواز آنے لگی اور فی الحقیقت کون مسلمان ہو سکتا تھا جس کا دل ان دردانگیز واقعات پر بھر نہ آتا، سو جو ہم گذشتہ باب کے اخیر پر بیان کر چکے ہیں۔ اور کس کے دل میں یہ آرزو پیدا نہ ہوتی ہو کہ ان ظالم مفسدوں کو سزا دیکر ملک میں امن کی حالت پیدا کی جائے۔ لیکن ایک تاریخ نویس دوسری طرف کی مشکلات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ حضرت عثمان کے قتل میں فی الحقیقت تینوں مقامات بصرہ اور کوفہ اور فسطاط کی بڑی بڑی جماعتیں ملوث تھیں۔ اگر کوئی ایک آدھ قاتل ہوتا تو اس کو پکڑ کر قتل کر دینا کچھ مشکل کام نہ تھا لیکن جو حالات پیدا ہو چکے تھے وہ خطرناک تھے۔ خود حضرت عثمان نے ان مفسدوں پر تلوار اٹھانا پسند نہ کیا تھا۔ کیونکہ اس سے خطرناک فساد کی آگ مشتعل ہوتی تھی اب اگرچہ حالات کسی قدر بدل چکے تھے۔ اور یہ لوگ جو بظاہر پہلے صرف چند شکایتوں کو لئے ہوئے اپنے آپ کو اصلاح کے طالب کہتے تھے اب ایک بے گناہ ہی نہیں سب سے قیمتی زندگی کے خون میں ہاتھ رنگ چکے تھے اور شریعت و اخلاق کی رو سے واجب القتل تھے مگر ان کو پکڑ کر سزا دینا ملک کے چاروں اطراف میں ایک ہی وقت ایک خطرناک فساد کھڑا کر دینا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ سلطنت اسلام ہی ان مفسدوں کے ہاتھ میں پڑ کر تباہ ہو جاتی۔ یا نظام حکومت درہم برہم ہو جاتا۔ چنانچہ جب طلحہ اور زبیر نے حضرت علی کے انتخاب کے بعد اس بات پر زور دیا کہ قاتلان عثمان کو سزا دی جائے تو آپ نے فرمایا کہ میں بھی اس ضرورت سے غافل نہیں۔ مگر میرے اختیار کی بات نہیں اگر اس وقت فساد

کی صورت رونما ہوئی تو بدوی اور غیر ملکوں کے باشندے ہی اٹھ کر ابتری پھیلا دیں گے اور ملک میں ایام جاہلیت کے حالات کا دور دورہ ہو جائیگا۔ یہ لوگ ابھی ہماری طاقت سے باہر ہیں آپ انتظار کریں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مجھے کوئی رستہ دکھا دے۔

نئے گورنروں کا تقرر

۳۶ہجری ۶۵۶ء

دنیا میں بسا اوقات ایسے پیچیدہ حالات واقع ہو جاتے ہیں کہ اعلیٰ درجہ کی نیک نیتی کے ساتھ دو شخص ایک نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے ایسے ہی حالات سے اس وقت حضرت علی کو سامنا تھا۔ ایک طرف کثرت سے لوگ ہیں جو نہایت نیک نیتی سے قاتلان عثمان سے قصاص لیا جانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ دوسری طرف حالات ملکی ایسے پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ اگر اُن لوگوں کے خلاف تلوار اٹھائی جاتی تو ملک میں ابتری پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ حضرت عثمان کے خون کا بدلہ حضرت علی بھی لینا چاہتے تھے مگر انکا خیال تھا کہ پہلے سلطنت کی وحدت کو قایم کر لیں۔ اور اس کے لئے انہوں نے بہترین رستہ یہی سمجھا کہ حضرت عثمان کے خلاف جو گورنروں کے متعلق شورش ہے۔ اس کا سب سے پہلے انسداد کیا جائے۔ دوسری طرف غالباً انہیں حضرت معاویہ کی طرف سے اندیشہ بھی تھا اس لئے انہوں نے سب گورنروں کو تبدیل کرنے کا ارادہ کیا۔ مغیرہ نے انہیں مشورہ دیا کہ یہ وقت نہیں پہلے لوگوں کا اجتماع آپ کی خلافت پر ہو جائے پھر گورنروں میں جو تبدیلی آپ چاہیں کریں۔ ابن عباس جب حج سے واپس آئے تو انہوں نے بھی یہی مشورہ حضرت علی کو دیا۔ اور معاویہ کے متعلق بالخصوص یہ کہا کہ وہ تو حضرت عثمان کے مقرر کردہ نہیں۔ بلکہ حضرت عمر کے زمانہ سے گورنر چلے آتے ہیں۔ ان کو آپ اپنی جگہ پر رہنے دیں۔ مگر حضرت علی نے ایسی وجوہات پر جن کا ہمیں علم نہیں اس مشورہ کو قبول نہ کیا۔ ممکن ہے کہ وہ معاویہ کی طرف سے خطرہ محسوس کر کے اسے ابتدا میں ہی دبانا چاہتے ہوں۔ اور ممکن ہے کہ وہ تمام شکایتوں کے سدباب کے لئے سردست بہترین راہ یہی خیال کرتے ہوں کہ سب گورنروں کو ایک مرتبہ تبدیل کر دیا جائے تاکہ کسی کو شکایت کا موقعہ بھی نہ رہے چنانچہ حضرت علی نے ابن عامر کی جگہ عثمان بن حنیف کو گورنر مقرر کیا اور ابن عامر

واپس آگئے۔ مصر پر قیس کو مقرر کیا گیا۔ اور وہ بھی کامیاب ہوئے۔ مگر کوفہ اور شام کے گورنروں نے اس حکم کو قبول نہ کیا۔ حضرت علی نے دوبارہ ان دونوں کو خطوط لکھے اور ان کو اپنی اطاعت کی طرف بلایا۔ ابوموسیٰ گورنر کوفہ نے اطاعت کا اقرار کیا۔ مگر معاویہ نے کچھ دیر بعد ایک آدمی کو خالی چٹھی دے کر بھیجا۔ اور دریافت کرنے پر قاصد نے کہا کہ ساٹھ ہزار آدمی دمشق میں حضرت عثمان کی خون آلود قمیص کے نیچے رو رہے ہیں اور وہ انتقام لینے پر تلے ہوئے ہیں اور خود آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھتے ہیں حضرت علی نے تعجب سے کہا کہ مجھے ذمہ دار سمجھتے ہیں اور پھر کہا کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میری طاقت میں نہیں کہ ان قاتلوں کا پیچھا کر کے انہیں سزا دے سکوں قاصد یہاں سے باہر نکلا تو چند لوگوں نے اس پر آوازے کسے کہ اسے قتل کردو۔ تو اس نے دھمکی دی کہ مسلح فوج قریب ہی ہے۔ حضرت علی پر گورنروں کے تقرر کے متعلق یہ الزام دیا گیا ہے۔ کہ انہوں نے جس قدر نئے گورنر مقرر کئے وہ اکثر اُن کے اپنے رشتہ دار ہی تھے ہو سکتا ہے کہ دوسروں پر ان کو اس قدر اعتماد نہ ہو جس قدر اپنے رشتہ داروں پر اور جب خود ان کی خلافت ابھی خطرہ کی حالت میں تھی۔ تو ایسا کرنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے کہ اس لئے انہوں نے اپنے عزیزوں کو مقرر کیا ہو کہ مفسدوں کا سرغنہ ابن سبا حضرت علی کے خاندان کو خاص وقعت دیتا تھا۔ اس لئے حالات پیش آمدہ میں انہوں نے اسی میں امن سمجھا ہو۔

معاویہ کے خلاف لڑائی کی تیاری

معاویہ کی طرف سے ایسے خط کا آنا اور قاصد کا یہ دھمکی دینا کہ فوج تیار ہے اور ساٹھ ہزار آدمی حضرت علی سے حضرت عثمان کے خون کا انتقام لینے پر آمادہ ہیں۔ ایسا امر نہ تھا کہ حضرت علی اُس کے معلوم ہونے پر خاموشی سے بیٹھ سکتے۔ سلطنت کا ایک عظیم الشان صوبہ باغی ہو رہا تھا۔ اور اس بغاوت کو فرو کرنا آپ کا اولین فرض تھا۔ آپ نے وعظ کیا اور سمجھایا کہ معاویہ کی کارروائی اتحاد اسلام کو توڑتی ہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ بغاوت کا بیج اگر لگ گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صوبہ صوبہ ہر جگہ خود مختار ہو جائیگا۔ اور اسلام کی قوت کا اس کے ساتھ ہی فیصلہ ہو جائیگا۔ اور بغاوت بغیر جنگ کے رفع نہ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ معاویہ کی طرف سے ایک قسم کی دھمکی

آچکی تھی غرض مدینہ میں معاویہ کے خلاف جنگ کا اعلان ہوگیا۔ اور فوج کی تیاری شروع ہوئی۔

لیکن حضرت علی کو صرف اس مشکل کا سامنا نہ تھا ہم دیکھ چکے ہیں کہ طلحہ اور زبیر بھی یہی رائے رکھتے تھے کہ حضرت علی کو سب سے پہلے قاتلان عثمان سے قصاص لینا چاہیئے۔ حضرت علیؓ نے اُن کے سامنے اپنی بیچارگی کا اظہار بھی کیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے اور مدینہ کو چھوڑ کر مکہ کا رستہ لیا۔ ادہر حضرت عائشہ حج سے واپس آرہی تھیں کہ انہوں نے رستہ میں ہی حضرت عثمان کے قتل کی خبر سنی۔ طلحہ اور زبیر بھی ان سے مل گئے انہوں نے بیان کیا کہ ہم مدینہ کو نہایت خطرناک حالت میں چھوڑ کر آئے ہیں ابتری پھیلی ہوئی ہے عوام الناس کی حالت خراب ہے۔ اور وہ نہ حق کو پہچان سکتے اور نہ باطل کا انکار کر سکتے ہیں۔ اور نہ اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ غرض طلحہ اور زبیر اور حضرت عائشہ مکہ پہنچ گئے سب لوگوں نے ان کی طرف رجوع کیا۔ حضرت عائشہ نے قرآن کی طرف رجوع کیا اور آیت ذیل کو حالات پر منطبق پایا۔ وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینہما، فان بغت احدہما علی الاخری فقاتلوا التی تبغی حتی تفئ الی امر اللہ، فان فائت فاصلحوا بینہما بالعدل واقسطوا، ان اللہ یحب المقسطین (الحجرات ۔ ۹) اگر مومنوں کی دو جماعتیں باہم جنگ کریں تو اُن کے درمیان اصلاح کرو۔ پھر اگر ان میں سے ایک دوسری پر زیادتی کرے تو اس کے ساتھ جنگ کرو جو زیادتی کرتی ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے پس اگر وہ لوٹ آئے تو اُن کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کرو۔ اور انصاف کرو۔ اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے مسلمان تو اپنی زندگیوں کو خدا کیلئے ہی سمجھتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے وہ اپنے آرام آسائش اپنی زندگی کو ہیچ جانتے تھے۔ جب کفار کے خلاف لڑائی کی ضرورت پیش آئی کیونکہ انہوں نے زیادتی کی تو انہوں نے کفار کے ساتھ لڑائی کی۔ اور اپنی جانوں کو خدا کی راہ میں دیا۔ اب اگر گھر میں ایک فریق کی زیادتی اس حد تک نظر آتی ہے کہ ان کا

قاتلان عثمان کی سزا کے لئے حضرت عائشہ۔ طلحہ۔ زبیر کی کارروائی

علاج سوائے لڑائی کے کچھ نہیں تو اب بھی اپنی جانوں کی پروا نہیں۔ مشورہ یہی ہوا کہ قاتلان عثمان کی سزا ضروری ہے۔ ورنہ اس طرح مفسدوں کو جرات ہو جائیگی آج حضرت عثمان کو قتل کیا ہے کل دوسرے جس پر چاہیں ہاتھ صاف کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ تک حضرت عائشہ نے انتظار بھی کیا۔ کہ شاید حضرت علی کچھ کارروائی کریں۔ مگر ادہر سے خاموشی دیکھکر بلکہ معاویہ کے خلاف چڑہائی کی خبر سن کر جب مایوسی ہوئی تو آخر یہ مشورہ ہوا کہ کیا کیا جائے۔ بعد مشورہ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے بصرہ کا رخ کیا جائے اس فیصلہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ کی غرض صرف اصلاح تھی۔ اگر ان کی یا حضرت طلحہ اور زبیر کی یہ غرض ہوتی کہ خلافت حضرت علی سے چھن جائے۔ اور طلحہ اور زبیر میں سے کوئی خلیفہ بنے تو نہایت آسان رستہ سامنے تھا۔ ادہر سے مکہ سے یہ چڑہائی کرتے۔ ادہر شام میں معاویہ موجود تھے اور حضرت علی کے خلاف شورش بھی خاصی تھی۔ ابھی باہر ان کی حکومت اچھی طرح جمی نہ تھی اور مدینہ میں کوئی فوج نہ تھی۔ لیکن چونکہ اصل غرض حضرت علی کے خلاف کوئی کارروائی کرنا نہ تھی۔ بلکہ قاتلان عثمان کو سزا دینا تھی۔ اس لئے مدینہ کی بجائے جس کا لے لینا بھی سہل تھا بصرہ کا رخ کیا گیا۔ اور وہ بھی اس وقت جب حضرت علی کی خلافت پر چوتھا مہینہ گذر رہا تھا۔ یہاں کے مفسدوں کا خاتمہ کرکے پھر کوفہ کی طرف بڑہنے کا ارادہ تھا۔ اور اس کے بعد مصر کے مفسدوں کی باری آتی۔

حضرت عائشہ طلحہ زبیر کی نیک نیتی

حضرت عائشہ طلحہ۔ زبیر۔ علی سب عالی الشان تھے۔ غلطی اُن میں سے کسی سے ہوسکتی تھی لیکن چاروں کی غرض نیک تھی۔ اول الذکر تینوں یقیناً طالب اصلاح تھے کسی قسم کی مخفی غرض دلوں میں پنہاں نہ رکھتے تھے۔ حضرت عثمان کے وقت بھی طلحہ۔ زبیر ان چھ منتخب آدمیوں میں سے تھے جن کا نام خلافت کے لئے تجویز ہوا تھا مگر انہوں نے اپنے حقوق کو حضرت عثمان یا علی کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ اب حضرت عثمان کے قتل کے بعد بھی حضرت علی نے خود طلحہ اور زبیر کو کہا تھا کہ میں ان دونوں میں سے کسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے تیار ہوں مگر انہوں نے خلافت کی خواہش ظاہر نہیں کی لیکن پہلے دن سے دونوں اس بات کے خواہاں تھے کہ سب سے پہلے ان مفسدوں

کا فیصلہ کرنا چاہئے جو قتل عثمان کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یہ کوئی ایسا خیال نہیں جو بعد میں اُن کے دلوں میں اٹھا ہو۔ اور حضرت عائشہ کی طرف تو کوئی ایسی خواہش ممکن طور پر بھی منسوب نہیں کی جاسکتی۔ تنگ دل لوگ جب تاریخ لکھنے بیٹھتے ہیں تو عظیم الشان انسانوں کا قیاس اپنی تنگدلی اور کینہ پروری پر کرکے ایسے ہی اغراض ان کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں حضرت عائشہ کو حضرت علی سے اس لئے رنج تھا کہ واقعۂ افک میں حضرت علی نے ان کی حمایت نہیں کی۔ حضرت علی ایک لمحہ کے لئے بھی ان لوگوں میں شامل نہ تھے جنہوں نے اس افک میں حصہ لیا ہو۔ آنحضرت صلعم نے حضرت علی سے اس بارہ میں ذکر کیا۔ تو آپ نے عرض کیا کہ لونڈی سے دریافت کرلیں۔ مطلب تو صاف تھا کہ اس قسم کا ناپاک ارادہ جو اہل افک حضرت عائشہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ایک آن کی آن میں انسان کے دل میں پیدا نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی عورت کے خیالات میں پاکیزگی نہ ہو تو آس پاس رہنے والے لوگ اور بالخصوص شب وروز کے خدمتگذار کبھی اس سے بے خبر نہیں رہ سکتے اول تو یہ حضرت عائشہ کے خلاف کوئی ایسی بات نہیں جس کا وہ رنج کریں اور اگر حضرت علی نے یہ لفظ بھی کہے ہوں کہ آپ چاہیں تو کسی دوسری عورت سے شادی کرسکتے ہیں تو اتنی بات کا رنج حضرت عائشہ کے دل میں اسقدر مدت رہے اور پھر اس کا انتقام وہ یوں لینے کی کوشش کریں کہ حضرت علی کی خلافت کو تباہ کرکے مسلمانوں میں فساد ڈلوائیں یہ کمینہ باتیں اس وسیع القلب پاک نفس بے نفس بی بی کی طرف منسوب نہیں ہوسکتیں جسکی بے نفسی اور وسیع القلبی کا ثبوت قدم قدم پر ملتا ہے اگر حضرت عائشہ کا دل ایسا تنگ ہوتا تو وہ حسان کو جنہوں نے فی الواقع افک میں حصہ بھی لیا تھا کس طرح معاف کر دیتیں اگر کوئی کینہ اس معاملہ کے متعلق ہوتا تو حسان کے ساتھ ہونا چاہئے تھا یا مسطح کے ساتھ ہونا چاہئے تھا لیکن اگر ان لوگوں کو بھی حضرت عائشہ نے کھلے دل سے معاف کر دیا تھا۔ تو حضرت علی کے ساتھ اتنی چھوٹی بات پر اتنی لمبی مدت تک کینہ رکھنا بے معنی بات ہے جو کچھ انہوں نے کیا غلط کیا یا صحیح کیا یہ الگ معاملہ ہے۔ لیکن ان کی غرض صرف اصلاح تھی۔ اگر حضرت علی کو خلافت سے محروم کرنے کا ارادہ ہوتا تو حضرت علی کے خلافت سنبھالتے ہی مدینہ پر حملہ کرنا چاہئے تھا۔ مگر چار ماہ تک انتظار کرنا پھر مدینہ کی بجائے بصرہ کا رخ کرنا صاف بتاتا ہے کہ اصل غرض صرف مفسدوں اور قاتلوں کی سزا تھی

حضرت عائشہ طلحہ۔ زبیر تینوں کا یہ خیال تھا کہ مفسدوں کی باگ ڈھیلی چھوڑنے میں حضرت علی سخت غلطی کر رہے ہیں اور کچھ بھی ہو مسلمانوں کا فرض اولین یہ ہے کہ جس گروہ نے بغاوت کر کے مسلمانوں کے خلیفہ اور امام کو قتل کر دیا ہے۔ اس کے خلاف اس آیت قرآنی کے ماتحت جو میں ابھی نقل کر چکا ہوں جنگ کر کے بھی اس کو سزا دینی چاہیئے۔ موطا امام محمد کی صحیح روایت میں یہ لفظ موجود ہیں کہ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ اس آیت کے حکم سے اعراض کرنا اچھا نہیں۔ ان کا بھائی محمد بن ابوبکر ان مفسدوں میں شامل تھا۔ مگر اس کی بھی حضرت عائشہ کو پروا نہ تھی۔ غرض صرف ایک تھی کہ حکم قرآنی کے ماتحت باغی طائفہ کے ساتھ جنگ کر کے اصلاح بین المسلمین کے کام کو سرانجام دیا جائے اور یہی غرض طلحہ اور زبیر کی تھی۔ اگر ان کے اجتہاد میں غلطی بھی تو ہو مگر وہ اعلیٰ درجہ کے نیک نیت اور پاک نفس انسان تھے۔ اور باوجود چند ہزار نفوس کی جانوں کے تلف ہونے کے اس کا آخری نتیجہ اسلام کے حق میں برا نہیں بلکہ اچھا ہوا اور ان لوگوں کی اس کارروائی کی وجہ سے مفسد کسی قدر دبے رہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ بعد میں حضرت عائشہ اس پر افسوس بھی کیا کرتی تھیں جس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے اجتہاد کی غلطی کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور یہ امر ان کی شان کو اور بھی بلند کرتا ہے یہ پاک نفس انسان احکام الٰہی کے آگے ایسے سر جھکانے والے تھے۔ کہ جب تک ایک امر کو حق سمجھا اس کے لئے آسایش اور آرام کو چھوڑ کر ہر طرح سے دکھ برداشت کیا۔ اور جان دے دینے کی بھی پروا نہیں کی اور جب معلوم ہوا کہ وہ اجتہاد درست نہ تھا تو اپنی غلطی کو بھی تسلیم کر لیا۔ کیونکہ حق یہی تھا کہ گو حضرت علی غلطی بھی کر رہے ہوں مگر ساتھ انہی کا دیا جائے اور مفسدوں کی سزا کو اپنے ہاتھ میں نہ لیا جائے بلکہ حکومت وقت کے ذریعہ سے اس سزا کا نفاذ ہو۔ مگر نیک نیتی کے غلط اجتہاد پر اللہ تعالیٰ بھی گرفت نہیں کرتا۔ انسان کو کیا حق ہے کہ اس بنا پر کسی پر الزام لگائے واقعات تاریخی سے قدم قدم پر شہادت ملتی ہے کہ حضرت عائشہ طلحہ زبیر اعلیٰ درجہ کی نیک نیتی کو لئے ہوئے پاک نفس انسان تھے جن کی غرض صرف اصلاح تھی۔

حضرت علی کی خلافت کے چوتھے مہینے حضرت عائشہ طلحہ اور زبیر کی سرکردگی میں

حضرت عائشہ کی بصرہ پر چڑھائی اور قبضہ

ربیع الاول ۳۶ھ اکتوبر ۶۵۶ء

ایک فوج مکہ سے بصرہ کو روانہ ہوئی راستے میں قافلہ والے باتیں کر رہے تھے کہ یہ حواٗب کا تالاب ہے اتنے میں کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی تو حضرت عائشہ کو رسول اللہ صلعم کی ایک پیشگوئی یاد آگئی کہ آپ نے امہات المومنین سے فرمایا تھا کہ تم میں سے کسی پر حواٗب کے کتے بھونکیں گے۔ اس پر آپ نے فوراً واپسی کا ارادہ کیا۔ مگر بہت سے لوگوں نے گواہی دی کہ یہ حواٗب کا تالاب نہیں اور لوگوں نے یہ بھی کہا کہ شاید آپ کی موجودگی سے اللہ تعالیٰ کوئی اصلاح کی صورت پیدا کر دے آپ واپس نہ جائیں۔ ادھر حضرت علی کو جب یہ معلوم ہوا کہ بصرہ کی طرف فوج جا رہی ہے تو انہوں نے سردست شام کے ارادہ کو ترک کر کے اس طرف کا رخ کیا مگر حضرت عائشہ آپ سے آگے بصرہ کو نکل چکی تھیں۔ غرض حضرت عائشہ بصرہ کے قریب پہنچیں تو والئے بصرہ نے دو آدمی بھیجے کہ آپ کی تشریف آوری کی کیا غرض ہے تو حضرت عائشہ نے بجواب کہا کہ ہماری غرض صرف اصلاح بین المسلمین ہے اور یہ فرض ہر مسلمان مرد و زن پر ہے۔ اور بتایا کہ کس طرح مفسدوں نے مدینہ پر حملہ کر کے وہاں فساد برپا کر دیا۔ بے گناہ خلیفۂ اسلام کو قتل کیا مال لوٹا اور بے گناہوں کو مارا پیٹا۔ اور ان پر طرح طرح کا تشدد کیا۔ مگر والئ بصرہ نے شہر کو ان کے حوالہ کرنے سے انکار کیا۔ آخر دونوں گروہ آمنے سامنے ہوئے۔ تو یہاں پر حضرت عایشہ نے اپنے آنے کی غرض پھر بصرف عثمان کے قاتلوں کی گرفتاری بیان کی ذیل میں ہم ان کی یہ تقریر سیرت عائشہ سے نقل کرتے ہیں۔

"لوگ عثمان پر اعتراض کیا کرتے تھے اُن کے عہدیداروں کی برائیاں بیان کرتے تھے مدینہ آکر ہم سے صلاح و مشورہ پوچھتے تھے۔ ہم ان کو صلح و آشتی کے متعلق جو رائے دیتے تھے وہ اس کو سمجھتے تھے عثمان کی نسبت ان کو جو شکایتیں تھیں ان پر جب غور کرتے تو ہم حضرت عثمان کو بے گناہ پرہیزگار راست گفتار اور ان شور و غل کرنے والوں کو گنہگار غدار اور دروغ گو پاتے تھے اُن کے

دل میں کچھ تھا اور زبان پر کچھ ان کی تعداد جب بڑھ گئی تو بے قصور اور بلا سبب عثمان کے گھر میں گھس گئے اور جس خون کا بہانا جائز نہ تھا اس کو بہایا جس مال کا لینا درست نہ تھا اس کو لوٹا جس زمین کا احترام ان پر فرض تھا اس کی بے حرمتی کی ہاں ہشیار وہ کام جواب کرتا ہے اور جس کے خلاف کرنا نا سزاوار ہے۔ وہ عثمان کے قاتلوں کی گرفتاری اور کلام الٰہی کے احکام کا مضبوطی سے اجرا ہے"

غرض لڑائی نہ تھی خونریزی نہ تھی بلکہ ایک دوسرے کو بحث سے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ بصرہ والوں میں سے کچھ لوگ متاثر ہو کر حضرت عائشہ کے ساتھ مل بھی گئے۔ اسی طرح اگلے دن بھی افواج ایک دوسرے کے سامنے تھیں مگر کسی کو تلوار اٹھانے کا حکم نہ تھا۔ یہ تمام واقعات حضرت عائشہ طلحہ اور زبیر تینوں کی نیک نیتی پر گواہ ہیں۔ لیکن اہل بصرہ میں مفسد گروہ بھی موجود تھا یہ لوگ تو ایسے موقعہ کی تاڑ میں رہتے تھے کہ مسلمانوں میں باہم جنگ ہو۔ ان میں سے ایک شخص نے بڑھ کر حملہ کر دیا۔ مگر حضرت عائشہ نے اپنی فوج کو ہٹا لیا۔ دوسرے دن دوسری جگہ ڈیرہ کیا۔ مگر مفسد لوگ پھر بھی باز نہ آئے اور ایک شخص نے ام المومنین کی شان میں ناپاک کلمات کہے اور بالآخر فساد کو بڑھاتے بڑھاتے عام حملہ کر دیا۔ حضرت عائشہ نے پھر بھی منادی کرائی کہ ہم لڑائی نہیں کرتے۔ مگر اہل بصرہ کے لشکر میں مفسدوں کے گروہ کی موجودگی نے اصلاح کی کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اور لڑائی شروع ہو گئی ادھر سے بھی دفاع کے لئے جواب دینا پڑا۔ اہل بصرہ نے سخت نقصان اٹھایا۔ اور پھر امان طلب کیا اس شرط پر صلح ہوئی کہ مدینہ میں ایک آدمی بھیجا جائے اگر یہ معلوم ہو کہ طلحہ اور زبیر نے باکراہ بیعت کی ہے۔ تو بصرہ اُن کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ورنہ یہ خود بصرہ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ قاصد گیا تو وہاں بھی اس بارے میں اختلاف پایا مگر زیادہ رجحان رائے کا اس طرف تھا کہ طلحہ اور زبیر کی بیعت باکراہ ہوئی ہے۔ غرض فیصلہ کوئی نہ ہوا اور مفسدوں نے موقعہ پا کر حضرت عائشہ پر شب خون مارا مگر ناکام ہوئے اور آخر حضرت عائشہ کی

افواج کا بصرہ پر تصرف ہو گیا۔ یہ واقعہ ۲۶۔ ربیع الآخر ۳۶ھ ہجری مطابق ۱۷۔ اکتوبر ۶۵۶ء عیسوی کا ہے۔

ان واقعات سے معلوم ہو گا کہ حضرت عائشہ ہرگز نہ چاہتی تھیں کہ مسلمانوں میں جنگ ہو۔ مگر دوسری طرف ایک ایسا گروہ پیدا ہو چکا تھا جس نے حضرت عثمان کے قتل پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ مسلمانوں میں فساد ڈلوا کر خلافت اسلامی کو تباہ کرنا چاہتے تھے۔ اور بدقسمتی کی بات ہے کہ اپنی اغراض کو حاصل کرنے کے لئے یہ حضرت علی کے طرفدار بن گئے تھے۔ ان کو فی الحقیقت حضرت علی سے بھی تعلق نہ تھا۔ جیسا آگے چلکر واقعات سے معلوم ہو گا مگر وہ حضرت علی کی فوج میں ملے ہوئے تھے۔ بصرہ پر جو لڑائی ہوئی وہ بھی انہی لوگوں کی وجہ سے ہوئی اور جنگ جمل میں بھی لڑائی کی ابتدا انہی لوگوں نے کر کے مسلمانوں کا کشت و خون کرایا۔ حضرت زبیر کو عین حالت نماز میں انہی میں سے ایک شخص نے شہید کیا۔ یہ لوگ حضرت عائشہ اور آپکے رفقاء کو محض قصاص خون عثمان کے مطالبہ کی وجہ سے کافر قرار دیتے تھے جیسا کہ ذیل کے خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو حضرت عائشہ نے بصرہ میں داخل ہونے کے بعد اہالیٔ کوفہ کو لکھا اس خط کا کچھ حصہ سیرت عائشہ مصنفہ سید سلیمان ندوی سے نقل کیا جاتا ہے۔

حضرت عائشہ لڑائی نہ چاہتی تھیں

"ہم نے بصرہ آکر اہل بصرہ کو کتاب الٰہی کی اقامت کی دعوت دی۔ صلحائے امت نے ہماری دعوت قبول کی اور جن میں بہتری نہ تھی انہوں نے تلوار سے ہمارا مقابلہ کیا اور کہا کہ تمہیں بھی ہم عثمان کے ساتھ روانہ کر دیتے ہیں۔ عناد سے انہوں نے ہم کو کافر بنایا اور ہماری نسبت نازیبا باتیں کہیں ہم نے ان کو قرآن کی یہ آیت پڑھ کر سنائی الم تر الی الذین اوتوا نصیباً من الکتاب الآیۃ۔۔۔ یہ سن کر کچھ لوگوں نے ہماری اطاعت قبول کر لی۔ اور بعضوں نے اختلاف کیا ہمنے انہیں چھوڑ دیا۔ لیکن باوجود اس کے بھی انہوں نے ہمارے ساتھیوں پر تلواریں چلائیں۔۔۔۔۔۔ ہم نے ۲۶ روز تک ان کو کتاب الٰہی کے احکام کی دعوت دی یعنی یہ کہ مجرموں کے علاوہ اور بے گناہوں کی خونریزی سے احتراز

کیا جائے انہوں نے ہمارے خلاف دلائل قائم کئے تاہم ہم نے صلح کر لی لیکن انہوں نے بدعہدی اور خیانت کی اور فوج جمع کی خدا نے عثمان کے قصاص کا سامان کر دیا ایک شخص کے سوائے ان شورش پسندوں میں سے کوئی اور نہیں بچا خدا نے قیس و رباب و ازد کے قبیلوں کے ذریعہ سے ہماری اعانت فرمائی۔ اب دیکھو بجز قاتلین عثمان جب تک خدا اُن سے اپنا حق نہ لے اوروں سے اچھی طرح پیش آؤ لیکن ان خیانت کاروں کی طرفداری نہ کرنا نہ ان کی حفاظت کرنا۔"

اور ایک خط میں یہ لفظ ہیں۔

"انہوں نے پھر بھی حق کو نہ پہچانا۔ اور اسی پر صبر نہ کیا۔ بلکہ ایک دفعہ تاریکی میں چھپ کر میرے قیام گاہ میں گھس آئے کہ مجھے مار ڈالیں وہ دہلیز تک پہنچ چکے تھے۔ ایک آدمی انہیں آگے آگے رستہ بتا رہا تھا کہ قیس رباب و ازد کے چند آدمی میرے دروازے پر پہرہ دیتے ان کو ملے۔ آ پائے جنگ نے گردش کی اور مسلمانوں نے ان کو قتل کر ڈالا۔ خدا نے تمام اہل بصرہ کو طلحہ اور زبیر کی رائے پر متفق کر دیا ہے قصاص لے لینے کے بعد ہم معاف کر دیں گے۔"

حضرت علی کی بصرہ پر چڑھائی اور طلحہ و زبیر سے گفت و شنید

حضرت علی کو جب معلوم ہوا کہ مکہ کی افواج لبر کر دگی حضرت عائشہ و طلحہ و زبیر آگے نکل چکی ہیں تو انہوں نے وہاں سے کوفہ کا رخ کیا۔ ابو موسیٰ اشعری گورنر کوفہ اطاعت اختیار کر چکے تھے مگر وہ بھی حضرت علی کے طریق عمل سے اتفاق نہ رکھتے تھے۔ اور حضرت عثمان کے قتل کا ان پر بھی بہت اثر تھا۔ آخر حضرت علی کے قاصدوں کے جانے پر اور ان کے بصرہ پر حملہ میں شمولیت کے قطعی انکار کی وجہ سے انہیں معزول کر دیا گیا اور کوفہ سے ایک جمعیت حضرت علی کے ساتھ ہو گئی۔ اور بیس ہزار فوج کے ساتھ بصرہ کے سامنے ڈیرہ ڈالا باوجود اس کے آپ کا خیال بھی جنگ سے اسی قدر دور تھا۔ جیسے حضرت عائشہ کا چنانچہ پہنچتے ہی آپ نے قعقاع کو طلحہ اور زبیر کے پاس بھیجا انہوں نے طلحہ اور زبیر سے کہا کہ عثمان کے خون کے عوض چھ سو آدمی بصرہ کے قتل ہو چکے ہیں۔ اب اور جنگ ہو گی تو اس میں چھ ہزار مارے جائیں گے۔ آخر

اس اندرونی فساد کا خاتمہ کس طرح ہوگا۔ اور یہ بھی سمجھایا کہ حضرت علی بھی قاتلان عثمان کو بغیر سزا کے نہیں چھوڑنا چاہتے مگر وہ ابھی مجبور ہیں۔ اور جبھی اطمینان کی صورت پیدا ہوتی ہے قاتلان عثمان کو سزا دی جائے گی۔ طلحہ اور زبیر نے بھی اس پر اپنی رضامندی ظاہر کی اور اسی طرح کئی دن تک سلسلہ صلح کی گفت وشنید کا جاری رہا۔

جمادی الثانی ۳۶ھ دسمبر ۶۵۶ء

لیکن جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔ حضرت علی کی فوج میں انہی لوگوں کا ایک بھاری عنصر تھا جنہوں نے حضرت عثمان کے خلاف یہ ساری سازش کی تھی۔ اور آپکو قتل کیا تھا انہوں نے جب دیکھا کہ فریقین میں صلح ہوا چاہتی ہے تو انہیں فکر ہوا کہ ان کی باری آئے گی۔ انہیں فائدہ اسی میں تھا کہ مسلمان باہم لڑتے رہیں۔ اور ان کے اعمال کی پاداش انہیں نہ ملے۔ پس انہوں نے مشورہ کر کے بغیر کسی کو اطلاع دینے کے جب دونوں لشکر سو رہے تھے حضرت عائشہ کی افواج پر شب خون مارا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رات کے وقت دونوں گروہوں کو پتہ نہ لگ سکا کہ لڑائی کس طرف سے شروع ہوئی ہے اور دونوں اس خیال میں لڑتے رہے کہ دوسرے نے بدعہدی کی ہے حضرت علی کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے بہتیرا روکنا چاہا مگر جنگ نہ رکتی تھی اور مسلمان ایک دوسرے کو کاٹتے رہے صبح ہوئی تو حضرت عائشہ سے لوگوں نے کہا کہ آپ سوار ہو کر چلیں شاید اسی سے لوگوں میں اصلاح ہو جائے چنانچہ آپ اونٹ پر سوار ہو کر نکلیں (اسی لحاظ سے اس لڑائی کا نام جنگ جمل ہے) ادھر حضرت علی نے طلحہ اور زبیر کو بلایا اور اُن سے بات چیت کی۔ کیا یہ حیرت انگیز منظر نہیں کہ جن کو ایک دوسرے کے دشمن سمجھا جاتا ہے۔ وہ عین میدان جنگ میں اس طرح ایک دوسرے سے ملاقات کر رہے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے دل صاف ہیں۔ ان کی نیتیں نیک ہیں وہ ایک امر کی اصلاح کے درپے ہیں۔ وہ سب مسلمانوں کا اتحاد چاہتے ہیں وہ ظلم وفساد وخونریزی سے متنفر ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ نفسانی اغراض سے خالی ہیں غرض یہ تینوں بزرگ جن کی فوجیں لڑ رہی ہیں میدان جنگ میں ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور حضرت علی کے کہنے پر دونوں لڑائی سے علیحدگی کے لئے واپس ہوتے ہیں۔ زبیر تو وہیں سے سیدھا مدینہ کا رخ کرتے ہیں۔ مگر ایک شریر سبائی، اُن کے پیچھے پیچھے ہو لیتا ہے جنگل میں

جنگ جمل

وہ ایک طرف ہو کر نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ جب سجدے میں جاتے ہیں تو وہ ان کا سر کاٹ دیتا ہے اور جب وہ سر لیکر حضرت علی کے پاس آتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ زبیر کے قاتل کو جہنم کی خبر دے دو۔ طلحہ بھی میدان جنگ سے الگ ہونے کے لئے نکلتے ہیں۔ مگر ایسے ہی کسی شریر نے موقعہ تاک کر ایک ایسا تیر مارا کہ آخر اسی سے آپ جان بحق ہوئے۔ لڑائی کی یہ حالت تھی کہ بغیر افسروں کے منشا کے کشتوں کے ڈھیر لگ رہے تھے۔ حضرت عائشہ نے قرآن کو بلند کیا کہ لڑائی بند کی جائے مگر شریروں نے اس شخص کو بھی مار دیا۔ آخر جہاں حضرت عائشہ تھیں اسی موقعہ پر حملہ کا زور ہوا۔ کیونکہ ان شریروں کا یہ منشا تھا کہ آنحضرت کی زوجہ مطہرہ کی بھی تحقیر کریں۔ ادھر سے لوگ کٹتے چلے جاتے تھے مگر اونٹ کے اردگرد اسی طرح دیوار قایم تھی۔ آخر زیادہ کشت و خون دیکھکر کسی شخص نے اونٹ کی کونچیں کاٹ دیں اور وہ گر پڑا۔ اور اس پر لڑائی کا خاتمہ ہو گیا۔ محمد بن ابوبکر نے آگے بڑھ کر دریافت کیا کہ کوئی چوٹ تو نہیں آئی۔ کچھ دیر کے بعد حضرت علی بھی آئے اور خیریت پوچھی اور پھر عزت کے ساتھ انہی کے ایک طرفدار رئیس کے گھر میں بصرہ میں اتارا اور آخر پورے احترام کے ساتھ چالیس عورتوں اور محمد بن ابوبکر کی ہمراہی میں مدینہ کو روانہ کیا۔ خود حضرت علی نے دور تک مشایعت کی اور حضرت عائشہ نے فرمایا کہ مجھ کو حضرت علی سے کوئی کدورت نہیں نہ پہلے تھی۔

لڑائیوں کے باوجود تعلقات محبت واحترام

ان واقعات پر پھر غور کرو کس قدر صفائی سے ظاہر ہے کہ گو فوجیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے پڑی ہیں گو تلواروں تک چل گئیں گو کشتوں کے انبار لگ گئے اور طلحہ اور زبیر جیسے فدائیان رسول بھی شہادت پا گئے لیکن دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت اور احترام موجود تھا بغض اور کینے سے دل پاک تھے۔ اسلام کی خیرخواہی یکساں سب کے مدنظر تھی۔ عین جنگ کے اندر طلحہ اور زبیر کس محبت سے حضرت علی سے ملتے اور ان کی بات کو قبول کرتے ہیں۔ اس کے خاتمہ کے ساتھ ہی کس احترام سے حضرت علی حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور حق فرزندی بجالاتے ہیں۔ جنگ جمل بصرہ کی پہلی جنگ کی طرح محض ان شریر

مفسدوں کی سازش کا نتیجہ تھا جو اسلام کے اتحاد کو پاش پاش کرنا چاہتے اور مسلمانوں کو آپس میں لڑوا کر مروانا چاہتے تھے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ حضرت علی کی فوج میں یہ گروہ موجود تھا اور غالباً حضرت علی مجبور تھے جیسا کہ اُنکے بار بار کے بیانات سے پایا جاتا ہے اصل منصوبہ بازی جو اس ساری جنگ وجدل کے پیچھے تھی انہیں مفسدین کی تھی۔ جنہوں نے حضرت عثمان کو شہید کیا۔ اور جو فی الحقیقت حضرت عثمان کے ہی نہیں سب مسلمانوں کے دشمن تھے مگر اپنا کام اسی طرح نکالنا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو مسلمانوں کے ہاتھ سے فنا کراویں۔ جب جنگ ختم ہو چکی تو حضرت علی نے حکم دیا کہ نہ کسی بھاگنے والے کا تعاقب کیا جائے نہ کوئی غنیمت کا مال لیا جائے نہ کوئی شخص کسی گھر کے اندر داخل ہو۔ جو لوگ جنگ میں مارے گئے حضرت علی نے اُن کے متعلق جس رائے کا اظہار فرمایا وہ یہ تھی کہ جو نیک نیتی سے اس میں شامل ہوئے خواہ کسی طرف سے شامل ہوئے ہوں اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے گا۔ زبیر کے قاتل کو آپ نے جہنمی بتایا ہاں اس پیغمبر کے جانشین کے اور اس کے صحبت یافتوں کے یہی طریق عمل شایان شان تھا۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

((جنگ جمل کے ساتھ مسلمانوں کے اُس باہمی اختلاف کا جو حضرت عثمان کی شہادت کے واقعات سے پیدا ہوا۔ مکہ۔ بصرہ اور کوفہ میں فیصلہ ہو گیا مگر شام میں اختلاف ابھی باقی تھا اور اب اس کا مٹانا حضرت علی کے مدنظر تھا تاکہ اتحاد اسلام دوبارہ قایم ہو جائے لیکن فی الحقیقت یہ اختلاف تو سطح پر تھا اندرونی طور پر جس طاقت نے مسلمانوں کو یہ نقصان پہنچایا تھا وہ ابھی اسی طرح موجود تھی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جنگ جمل میں اپنی منصوبہ بازی سے انہوں نے اور بھی زیادہ طاقت حاصل کرلی تھی اور باوجود بصرہ میں امن قایم کر لینے کے حضرت علی کو ابھی ان ظالموں کے ہاتھ سے چھٹکارا نہ ملا تھا

کوفہ کو دارالخلافہ بنانا اور معاویہ کو دعوت اطاعت

بصرہ پر عبداللہ بن عباس کو گورنر مقرر کر کے اب حضرت علی نے کوفہ کا رخ کیا جو بجائے مدینہ کے اب خلافت اسلامی کا دارالخلافہ مقرر کیا گیا۔ اور رجب ۳۶ھ ہجری میں آپ وہاں داخل ہوئے کوفہ جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں بصرہ کی طرح حضرت عمر کے زمانہ کی ایک نئی آبادی تھی تاریخ اس امر پر کچھ

رجب ۳۶ھ ۶۵۶ء

روشنی نہیں ڈالتی کہ وہ کونسی وجوہات تھیں جن کی بنا پر حضرت علی نے مدینہ کو چھوڑ کر کوفہ کو دارالخلافہ تجویز کیا۔ لوگوں نے طرح طرح کی وجوہات تجویز کی ہیں مگر میرے نزدیک ظاہرامر صرف اس قدر ہے کہ مدینہ ایک طرف واقع تھا اور نئی وسیع سلطنت کا مرکز ہونے کے لئے کوفہ زیادہ موزوں تھا علاوہ ازیں یہاں دارالخلافہ کے ہونے سے بدوی اقوام سلطنت کے اثر کے نیچے زیادہ آسانی سے رہ سکتی تھیں۔ حضرت علی نے اشتر کو جو بغاوت کے سرغنوں میں سے ایک تھا اپنے ساتھ رکھا اس لئے کہ ان کا خیال ہوگا کہ اگر اسے علیحدہ چھوڑ دیا گیا تو یہ کوئی نیا فساد کھڑا کر دے گا۔ جب بصرہ میں عبداللہ بن عباس کو گورنر مقرر کیا گیا۔ تو اس شخص نے پھر بڑبڑانا شروع کیا۔ کہ عثمان اور طلحہ اور زبیر کا خاتمہ کر دینے سے ہمیں کیا فائدہ ہوا اب علی اپنے رشتہ داروں کو گورنریوں پر مقرر کرتے چلے جاتے ہیں کوفہ میں آکر حضرت علی نے معاویہ کو پھر خط لکھا کہ ان کے انتخاب پر جو مخالفت بصرہ میں اُٹھی تھی وہ فرو ہوگئی اب استحکام سلطنت کے لئے یہ ضروری ہے کہ معاویہ بھی اطاعت اختیار کر لیں۔ معاویہ نے پھر خط کا جواب نہ دیا۔ اور کچھ دیر بعد زبانی کہلا بھیجا کہ میری اطاعت قاتلین عثمان کی سزا سے وابستہ ہے اس پر مجبور ہو کر حضرت علی نے معاویہ کے خلاف اعلان جنگ کیا اور فوج کی تیاری میں لگ گئے۔

حضرت علی اور معاویہ کے تعلقات

حضرت علی اور معاویہ کے تعلقات میں شروع سے ہی اس قسم کی کشیدگی نظر آتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاویہ سرے سے حضرت علی کی خلافت کو ہی ناپسند کرتے تھے اور کسی صورت میں اطاعت اختیار کرنے کو تیار نہ تھے جو خلوص حضرت عائشہ اور طلحہ اور زبیر کی کارروائی میں نظر آتا ہے وہ یہاں مفقود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت عثمان کے ساتھ معاویہ کا تعلق قرابت بہت زیادہ تھا اور انہیں حق پہنچتا تھا کہ حضرت عثمان کے خون کا مطالبہ زیادہ زور سے کریں لیکن دونوں دفعہ حضرت علی کے خطوط کا جواب نہ دینا صاف بتاتا ہے کہ وہ حضرت علی کی خاموشی کو حضرت عثمان کے قتل پر رضامندی کا قائمقام سمجھتے تھے اور قریب قریب یہی زبانی پیغام انہوں نے بھیجا تھا۔ دوسری طرف اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ حضرت علی نے اب تک ان مفسدین کے قلع قمع کے لئے کوئی کارروائی نہ کی تھی۔ اور ان کی فوج میں ایک زبردست عنصر انہی مفسدوں کا موجود تھا بلکہ یہی لوگ جنگ جمل کا موجب تھے۔ ورنہ طلحہ اور زبیر حضرت علی کے یہ یقین دلانے پر کہ استحکام سلطنت کے بعد وہ مفسدوں کی

خبریں گے رہی ہو چکے تھے حضرت علی نے بار بار جو عذر پیش کیا وہ یہی تھا کہ وہ اسوقت اس قابل نہیں کہ ان لوگوں سے قصاص لے سکیں کیونکہ یہ قصاص صرف اس قدر نہ تھا کہ ایک آدھ آدمی کو جو فی الواقعہ حضرت عثمان کے قتل کا مرتکب ہوا تھا قتل کر دیا جاتا۔ بلکہ اصل غرض تب پوری ہوتی تھی کہ ان مفسدوں کا قلع قمع کیا جائے اور سرغنوں کو مار کر باقی لوگوں کو ان کے فریب سے باہر نکالا جائے۔ حضرت علی بار بار یہی کہتے تھے کہ میں ابھی اس قابل نہیں اور مجبوری سے رکا ہوا ہوں۔ حضرت عائشہ اور طلحہ اور زبیر نے آپ کے اس عذر کو صحیح تسلیم کر کے مخالفت چھوڑ دی تھی۔ مگر معاویہ نے بجائے اس عذر کو صحیح سمجھنے کے حضرت علی کو ایک طرح سے شریک جرم سمجھ لیا اور یہ خیال کر لیا کہ حضرت علی نے عمداً ان مفسدوں کو پناہ دی ہوئی ہے۔ اور وہ ان کے اس فعل پر راضی ہیں اکثر مورخین کا خیال ہے کہ معاویہ نیک نیتی سے طالب قصاص تھے اور وہ اگر خلافت کے خواہاں نہ تھے تو کم سے کم یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے حضرت علی پر حسن ظن سے کام نہ لیا۔ اور بغاوت اختیار کی لیکن دونوں طرف حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ ان دونوں بزرگوں کو ایک دوسرے پر اعتماد نہ رہا اور آخری فیصلہ کے لئے تلوار کی طرف رجوع کرنا پڑا۔

غرض حضرت علی پچاس ہزار فوج لیکر شام پر بڑھے معاویہ کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے بھی اپنی افواج کو جمع کیا اور مقام صفین پر دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ یہ مقام حلب کے جنوب مشرق اور حمص کے شمال مغرب میں دریائے فرات کے کنارے پر تھا حضرت علی چونکہ گذشتہ واقعات سے متنبہ ہو چکے تھے اس لئے حکم دیدیا تھا کہ حملہ میں ہماری طرف سے پہل نہ ہو علاوہ ازیں وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ یہ معاملہ باہمی بات چیت سے طے ہو جائے اور جنگ تک نوبت نہ پہنچے۔ چنانچہ کچھ دنوں تک یونہی معمولی نقل و حرکت دونوں فوجوں کیطرف سے ہوتی رہی حضرت علی نے تین آدمی معاویہ کے پاس بھیجے کہ سلطنت اسلامی کی بہتری کے لئے وہ اطاعت اختیار کر لیں۔ معاویہ نے کہا کہ پہلے حضرت عثمان کے قاتلوں کو سزا دی جائے بالمقابل یہ کہا گیا کہ یہ محض ایک بہانہ ہے تب معاویہ نے ناراض ہو کر کہا کہ یہ جھوٹ ہے اور ہمارے تمہارے درمیان تلوار ہی فیصلہ کرے گی۔ آخر حضرت علی نے اپنی فوج کو آٹھ دستوں میں تقسیم کر کے یہ حکم دیا کہ روزانہ ایک دستہ لڑائی کے لئے نکلا کرے غرض صرف یہ تھی کہ عام طور پر لڑائی شروع نہ ہو جس سے مسلمانوں کی خونریزی ہو نیا سال شروع ہوا اور محرم کے مہینہ میں جنگ ملتوی رہی۔ اور صلح کے لئے مزید گفت و شنید ہوتی رہی۔ لیکن دونوں طرفین اپنے اپنے خیال پر جمی ہوئی تھیں۔ اور کوئی بات طے نہ ہو سکی آخر محرم کے اختتام پر اور صفر کے شروع ہونے

جنگ صفین۔

ذیقعد ۳۶ھ

اپریل ۶۵۷ء

۱۲۔۱۰۔۱۳ صفر ۳۷ھ

۲۶۔۲۸۔۲۹ جولائی ۶۵۷ء

پر مقابلہ کی ٹھن گئی حضرت علی نے ایک دفعہ پھر معاویہ کی افواج کے سامنے اعلان کر دیا کہ اہل شام کو خلیفہ کی اطاعت کر لینی چاہیئے لیکن اسکا کچھ اثر نہ ہوا اس دن کے معمولی چھوٹے چھوٹے مقابلوں کے بعد آخر ۱۱ صفر کو عام حملہ ہوا دن بھر کی لڑائی سے کچھ فیصلہ نہ ہوا ۱۲ کو پھر عام جنگ شروع ہوئی اور شام پڑ گئی مگر کچھ فیصلہ نہ ہوا۔ رات کو بھی لڑائی جاری رہی اسی حالت میں صبح ہو گئی اور لڑائی دست بدست جاری تھی کہ عمرو بن العاص کے مشورہ سے معاویہ نے قرآن کریم کو نیزوں سے بندھوا کر بلند کیا اور لڑائی کی صفوں میں منادی کرائی کہ کتاب اللہ موجود ہے اسی کا فیصلہ منظور ہے۔ کہا جاتا ہے اس آواز کے بلند ہونے کی دیر تھی کہ حضرت علی کی افواج نے بھی اسی آواز کو بلند کیا۔ قرآن کریم کی عجازی طاقت تھی کہ اسکی طرف رجوع کا خیال آتے ہی لڑائی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور دونوں طرف کی فوجوں نے قرآن کریم کا نام سنتے ہی تلواریں نیام میں کر لیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت علی نے اپنی فوج کو جنگ بند کرنے سے روکا اور کہا کہ یہ محض تمہیں دھوکا دیا جاتا ہے۔ مگر فوج نے نہ مانا۔ مسلمانوں میں لڑائی کے متعلق۔ اور لڑائی کے بعد مسلمانوں سے سلوک کے متعلق حضرت علی کا جو کچھ رویہ ہمیں گذشتہ ساری لڑائیوں میں نظر آتا ہے وہ اس خیال کے سراسر خلاف ہی ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علی قطعاً مسلمانوں میں جنگ پسند نہ کرتے تھے اس لئے یہ روایت صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ فوج نے حضرت علی کو مجبور کر کے جنگ رکوائی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اشتر نے لڑائی کو جاری رکھا۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ اشتر اُن لوگوں میں سے تھا جو حضرت عثمان کے زمانے میں فتنہ کے بانی تھے۔ حضرت علی نے اسے بلوایا تو اس نے کہا ابھی ہماری فتح ہوتی ہے ہم لڑائی بند نہیں کریں گے۔ اور جب تک فوج کے باقی حصے نے اسے مجبور نہیں کر دیا۔ لڑائی کو نہ چھوڑا اس کے بعد حضرت علی نے معاویہ سے دریافت کیا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ لڑائی بند کی جائے اور ایک ثالث ہماری طرف سے مقرر ہو جائے اور ایک آپ کی طرف سے اور وہ دونوں قرآن کریم کی بناء پر جو فیصلہ اتفاق رائے سے کریں اسے دونوں فریق منظور کریں۔ حضرت علی کی طرف سے ابو موسیٰ اشعری ثالث مقرر ہوئے اور معاویہ کی طرف سے عمرو بن العاص قرار یہ پایا کہ یہ دونوں چار چار سو آدمی اپنی اپنی طرف کے لیکر ایک درمیانی مقام میں جمع ہوں اور قرآن کریم فیصلہ کریں اگر دونوں میں اتفاق رائے نہ ہو تو آٹھ سو آدمیوں کی کثرت رائے سے جو فیصلہ ہو وہ دونوں کو منظور ہوگا۔ حضرت علی کوفہ کو واپس چلے گئے۔ اور معاویہ دمشق کو۔ صرف اشتر اس فیصلہ پر ناراض تھا۔

افواج کی علیحدگی

اس صلح نے بظاہر ان لوگوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ جو فساد کے خواہاں تھے اور کوفہ کے راستے میں ہی بارہ ہزار آدمیوں کا ایک گروہ حضرت علی سے الگ ہو گیا۔ گو اب تک وہ لشکر کے

ساتھ ساتھ ہی آرہے تھے جب حضرت علی کوفہ پہنچ گئے تو ان لوگوں نے ایک مقام حرورا پر ڈیرہ جمایا کوفہ کی تین قوموں تمیم بکر اور ہمدان کے بڑے بڑے لوگ ان کے سرگروہ تھے ابھی تک تو یہ لوگ یہی کہتے تھے کہ ثالثوں کا فیصلہ ناقابل قبول ہے فیصلہ وہی ہے جو خدا کرے اور مطلب اُن کا یہ تھا کہ جنگ جاری رہے جس فریق کی فتح ہوگی اسی کے لئے خدائی فیصلہ مسلم ہوگا اور اصل میں یہ خلافت پر ہی ہاتھ صاف کرنا چاہتے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت عائشہ اور طلحہ اور زبیر بصرہ میں آئے تو حضرت علی کی فوج میں سے یہی لوگ تھے جو ان راستبازوں کو کافر کہتے تھے اسی طرح وہ معاویہ اور ان کے ساتھیوں کو کافر کہکر جنگ کو ضروری قرار دیتے۔ حضرت علی نے ان کی اس بات کو تسلیم نہ کیا۔ اور فرمایا کہ یہ بھی ہمارے مسلمان بھائی ہیں گو انہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے مگر ہم انہیں کافر نہیں کہہ سکتے حضرت علی نے ان لوگوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی البتہ حرورا میں جو اُن کا مجمع تھا اسے انہوں نے منتشر کردیا لیکن اپنے کام میں لگے رہے۔

ثالثوں کا فیصلہ

شعبان ۳۷ھ فروری ۶۵۸ء

تاریخ مقررہ پر ابوموسیٰ اور عمرو بن العاص چار چار سو ساتھیوں کے ساتھ دومۃ الجندل میں جمع ہوئے اور ایک خیمہ میں دونوں میں بحث ہوتی رہی اور سوال کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا گیا۔ آخری فیصلہ دونوں کا جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے یہ تھا کہ علی اور معاویہ دونوں کو خلافت سے الگ کرکے کسی اور آدمی کا انتخاب کیا جائے مگر نئے آدمی کا انتخاب ان دو کا کام نہ تھا۔ بلکہ وہ شوریٰ کا کام تھا اس بات پر دونوں کا اتفاق ہوگیا جب خیمہ سے باہر نکلے اور مجمع میں آئے تو عمرو نے ابوموسیٰ سے کہا کہ پہلے آپ فیصلہ سنائیں۔ انہوں نے اس کے مطابق بیان کردیا اس کے بعد عمرو بن العاص کی باری تھی ان کی طرف یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ابوموسیٰ سے دھوکا کیا اور کہا کہ جہاں تک حضرت علی کی معزولی کا سوال ہے میں ابوموسیٰ کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں مگر معاویہ کی میں تائید کرتا ہوں یعنی علی کو معزول کرتا ہوں مگر معاویہ کو نہیں۔ اصل بات صرف اس قدر معلوم ہوتی ہے کہ ابوموسیٰ اور عمرو بن العاص نے جو کچھ بحث کی وہ خلافت کے متعلق تھی اور خلافت سے ہی دونوں کی علیحدگی پر فیصلہ ہوا تھا مگر معاویہ کے عامل شام رہنے یا نہ رہنے کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا اور نہ وہ سوال زیر بحث آیا اس لئے جو کچھ عمرو بن العاص نے کہا وہ غالباً اسی قدر تھا کہ خلافت نہ حضرت علی کے سپرد کی جائے نہ معاویہ کے لیکن معاویہ کے عامل شام ہونے کی میں تائید کرتا ہوں۔ عمرو بن العاص کے پایہ کے صحابی

پر یہ الزام کہ وہ اندر سے ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ کچھ اور وعدہ کر آئے تھے اور باہر آکر کچھ اور کہدیا۔ کسی صورت میں صحیح معلوم نہیں ہوتا لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اس فیصلہ سے اختلاف کے رفع ہونے کی صورت نہ ہوئی اور بات جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ کیونکہ معاویہ جب تک اطاعت اختیار نہ کرتے اتحاد اسلام قایم نہ ہوتا تھا۔ اور نئے خلیفہ کا انتخاب بھی مفید نہ ہو سکتا تھا تاہم اس قدر ماننا پڑتا ہے کہ معاویہ نے سنہ ۴۰ھ تک یعنی حضرت علی کی شہادت تک امیر المومنین کا لقب اختیار نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خلافت کے مدعی نہیں ہوئے۔ باقی رہا یہ قصہ کہ اس کے بعد حضرت علی معاویہ اور عمرو بن العاص اور ان کے رفقا پر اور معاویہ حضرت علی امام حسن اور حسین اور ان کے ساتھیوں پر لعنت کیا کرتے تھے یہ بعد کا بنایا ہوا ہے اور قابل قبول نہیں

شوال ۳۷ھ
مارچ ۶۵۸ء

حضرت علی کی خوارج سے جنگ

ادھر ثالثوں کے فیصلہ کی شہرت ہو گئی ادھر خوارج نے علانیہ بغاوت کا جھنڈا کھڑا کیا۔ بصرہ اور کوفہ دونوں مقامات سے یہ لوگ نکل کر مدائن کی طرف بڑھے تاکہ اس پر قبضہ کر کے وہاں اپنی حکومت قایم کریں لیکن وہاں کے گورنر کو اسکی اطلاع مل گئی اور یہ کوشش ناکام ہوئی۔ یہاں سے وہ اور بڑھکر دجلہ کو عبور کر کے چار ہزار کی تعداد میں نہروان پر جمع ہوئے۔ ادھر حضرت علی نے ثالثوں کے فیصلہ کو ناقابل قبول پا کر پھر شام پر چڑھائی کی تیاری کی۔ اور خوارج کو بھی اطاعت کیلئے بلایا مگر انہوں نے نہ صرف سختی سے جواب دیا اور کہلا بھیجا کہ آپ اپنے مرتد ہونے کا اقرار کریں۔ بلکہ اب ملک میں لوٹ مار شروع کردی حضرت علی کو جب یہ شکایات پہنچیں تو بجائے شام پر بڑھنے کے آپ نہروان کی طرف بڑھے اور وہاں پہنچ کر ان کو کہلا بھیجا کہ جن لوگوں نے قتل و غارت گری میں حصہ لیا ہے اگر وہ حوالے کر دیئے جائیں تو آپ سکو معافی دے دیں گے آخر حضرت علی کے سمجھانے پر ان میں سے کچھ لوگ یا تو مقابلہ چھوڑ کر الگ ہو گئے یا حضرت علی کیساتھ آملے لیکن اٹھارہ سو آدمی باقی رہ گئے جنہوں نے نہ اطاعت اختیار کی اور نہ مقابلہ چھوڑا۔ اور آخر حضرت علی کے ساتھ لڑائی کر کے سب مارے گئے۔

فتنہ خوارج

اس جنگ کیساتھ فتنہ خوارج کا خاتمہ نہیں ہوا۔ بلکہ جو لوگ یہاں سے بظاہر مقابلہ چھوڑ کر نکل گئے تھے انہوں نے دوسرے مقامات پر جا کر اس فتنہ کو پھیلانا شروع کیا۔ اور لوگوں کو مخفی طور پر حضرت علی کے خلاف اٹھانا شروع کیا گو اب یہ صرف وہی لوگ تھے جنہوں نے حضرت عثمان کے وقت فتنہ کھڑا کیا تھا اور گو انہوں نے کچھ اپنے الگ اصول بھی قایم کر لئے تھے اور اپنی تحریک کو ایک مذہبی رنگ دے لیا تھا لیکن فی الحقیقت خوارج کا فتنہ حضرت عثمان کے زمانہ کے فتنہ کا ہی دوسرا رنگ تھا یہ لوگ سلطنت اسلامی کے دشمن بن گئے۔ اور گو ظاہر طور پر ان کا فتنہ کم زور

ہو گیا تھا لیکن اندر ہی اندر ہر ممکن تدبیر سے یہ سلطنت کی بنیادیں کھوکھلی کرنے میں مصروف رہتے تھے جب حضرت علی جنگ نہروان سے فارغ ہوئے تو آپ نے شام پر بڑھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن فوج نے چاہا کہ کوفہ پہنچ کر اور وہاں سے سامان وغیرہ از سر نو درست کر کے پھر اس مہم پر جائیں چنانچہ حضرت علی کوفہ آ گئے۔ لیکن گھروں میں پہنچکر فوج کے دلوں میں کمزوری پیدا ہو گئی۔ اور مہم شام پر جانے سے دل چرانے لگے۔ غالباً فتنہ پردازوں نے یہاں کافی طور پر زہر پھیلا دیا تھا ادھر کچھ واقعات مصر میں ایسے پیدا ہو گئے کہ حضرت علی کو مہم شام کا ارادہ ترک کرنا پڑا

مصر پر معاویہ کا قبضہ

مصر میں حضرت علی نے قیس کو گورنر مقرر کیا تھا قیس ایک نہایت سنجیدہ اور فہیم آدمی تھے مصر میں جو فریق قاتلان عثمان کے قصاص کا طالب تھا اس سے آپ نے تعرض نہیں کیا اور رفتہ رفتہ وہ ایک زبردست جتھا پیدا ہو گیا۔ اسے لوگوں نے قیس کی کمزوری کا نتیجہ بتایا اور آخر حضرت علی نے انہیں واپس بلا کر ان کی جگہ محمد بن ابوبکر کو مصر کا گورنر مقرر کیا یہ تیز طبیعت آدمی تھا۔ جاتے ہی زور سے اس جتھے کو دبانا چاہا انہوں نے اطاعت اختیار کرنے سے انکار کیا اور آخر ۳۷ھ کے آخر میں مصر میں عام بغاوت پھیل گئی۔ ان حالات کو دیکھکر معاویہ نے عمرو بن العاص کو مصر پر حملہ کے لئے کہا ادھر سے حضرت علی نے جو مصر سے دور پڑے ہوئے تھے اشتر کو گورنر مصر کی امداد کے لئے بھیجا۔ مگر قبل اسکے کہ وہ مصر میں پہنچے سرحد کے کسی رئیس نے زہر دیکر اس کا کام تمام کر دیا۔ اور عمرو بن العاص نے محمد بن ابوبکر کو شکست دی اور مصر پر معاویہ کا قبضہ ہو گیا۔ اور حضرت علی کی سلطنت میں سے یہ حصہ بھی نکل گیا۔

صفر ۳۸ھ
جولائی ۶۵۸ء

شعبان
فروری

حضرت علی کے باقی ماندہ ایام

مصر کے جاتے رہنے سے حضرت علی کی خلافت کو اور بھی نقصان پہنچا ادھر خوارج کا فتنہ جڑ پکڑ چکا تھا اور یہ لوگ کبھی کہیں اور کبھی کہیں سر اٹھاتے اور سلطنت کو نقصان پہنچاتے رہتے تھے ۳۸ھ ہجری میں بصرہ میں پھر فساد ہو گیا۔ ابن عباس جو بصرہ کے اصل گورنر تھے اس وقت کوفہ آئے ہوئے تھے اُنکے معاون زیاد کو دوسری جگہ پناہ لینا پڑی۔ آخر حضرت علی کی تحریر پر چند رئیسوں نے زیاد کی مدد کی اور باغیوں نے شکست کھائی مگر ایک طرف یہ فتنہ دبتا تھا تو دوسری طرف اٹھ کھڑا ہوتا تھا خریت ایک شخص تھا جو جنگ جمل اور جنگ صفین میں حضرت علی کے ساتھ تھا اب وہ بھی بگڑا حضرت علی نے اسے سمجھانا چاہا مگر وہ اپنے ساتھیوں کو لیکر نکل گیا اور آخر اہواز میں پہنچکر لوگوں کو بغاوت پر کھڑا کر دیا ایک دفعہ بصرہ کی فوج نے اسے بھگا بھی دیا۔ مگر وہ لوٹا یہاں تک کہ آخر جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔ تب یہ بغاوت فرو ہوئی لیکن اسکے فرو ہونے کے ساتھ کرمان میں بغاوت پھوٹی۔ آخر حضرت علی نے زیاد کو اس کے فرو کرنے کے لئے مقرر کیا۔ اور

۳۸ تا ۴۰ھ
۶۵۸ تا ۶۶۰ء

کامیاب ہوا اور سلیقہ اٹائی سے ان لوگوں پر حکومت کی کہ لوگوں کو نوشیروان کا زمانہ عدل و انصاف یاد آگیا
لیکن اب دوسری طرف مشکلات کا سامنا تھا۔ معاویہ کی طرف سے ہمیشہ کچھ چھیڑ چھاڑ رہتی یہاں تک کہ
مدینہ اور مکہ اور یمن تک بھی معاویہ کے آدمی پہنچ گئے۔ حضرت علی نے فوج بھیجکر دوبارہ ان مقامات
پر اپنی حکومت قایم کی۔ اسی اثنا میں عبداللہ بن عباس حضرت علی سے ناراض ہو کر مکہ میں آ گئے۔ ان
پریشانیوں کے اندر حضرت علی نے معاویہ کے ساتھ صلح کر لینا مناسب سمجھا جسکی رو سے معاویہ مصر اور
شام پر قابض رہے اور باقی سلطنت حضرت علی کے ماتحت رہی اور عراق اور شام کی باہمی چھیڑ چھاڑ بند ہو گئی
حضرت علی اور معاویہ میں اس آخری صلح سے فتنہ پرداز گروہ یعنی خوارج کی امیدوں پر پانی پھر
حضرت علی کی شہادت | گیا۔ جو مسلمانوں کے اندر لڑائی کے جاری رہنے میں ہی اپنی کامیابی سمجھتے تھے — ۱۷ رمضان ۴۰ھ / ۲۷ جنوری ۶۶۱ء
لگائے ہوئے تھے لیکن اُن کے منصوبے اسی طرح باقی تھے آخر تین آدمیوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا
کہ ایک ہی دن ایک ہی وقت حضرت علی معاویہ اور عمرو بن العاص کا فیصلہ کیا جائے منصوبہ یہ سوچا گیا
کہ تینوں آدمیوں میں سے ایک کوفہ میں ایک دمشق میں اور ایک فسطاط میں پہنچ جائے اور رمضان
کے مہینہ میں ایک جمعہ کے دن صبح کی نماز کے وقت تینوں اپنا وار کریں۔ اتفاق کی بات ہے کہ مصر میں
عمرو بن العاص تو اس دن بیمار تھے اور ان کی جگہ دوسرا آدمی مارا گیا۔ دمشق میں معاویہ کو زخم لگا اور گو
سخت تھا مگر آخر وہ شفا پا گئے حضرت علی کو شہید کرنے کا ذمہ ابن ملجم نے لیا تھا اس نے کوفہ میں دو
اور اپنے ساتھ ملائے اور جب حضرت علی فجر کی نماز کے لئے نکلے تو تینوں یکدم تب ان پر ٹوٹ پڑے ابن ملجم
گرفتار ہو گیا ایک قاتل مارا گیا اور تیسرا بھاگ گیا۔ حضرت علی کو اٹھا کر واپس مکان پر لے گئے آپ نے اپنے قاتل
کو سامنے بلوایا اور حضرت حسن سے فرمایا کہ اگر میں مر جاؤں تو اسے قتل کیا جائے لیکن اور کوئی زیادتی اس پر نہ
ہو۔ آخر حضرت علی نے ۱۷ رمضان کو داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے مولیٰ سے جا ملے۔
حضرت علی ساٹھ سال کی عمر میں شہید ہوئے اور آپ کی خلافت کا زمانہ صرف چار سال نو ماہ ہے اس
آپ کی خلافت کا زمانہ | مختصر حکومت کے زمانے میں سلطنت اسلام میں کوئی توسیع نہیں ہوئی بلکہ اندرونی
جھگڑوں کی وجہ سے ہزارہا مسلمان خانہ جنگی میں مارے گئے اور آپکا زمانہ خلافت خود آپکے لئے بھی تکلیف کا موجب
رہا مگر میں شروع میں کہہ چکا ہوں یہ واقعات حضرت علی کی کسی غلطی یا کمزوری سے پیدا نہیں ہوئے۔
بے شک کمزوری سے کوئی انسان خالی نہیں اگر عثمان یا حضرت علی نے کوئی غلطی کی ہو تو اس سے ان کی

خلافت رسول کے منصب کی عزت کسی طرح کم نہیں ہوتی خلافت راشدہ کے چار مختلف زمانے ہیں اور وہ چاروں مسلمانوں کو چار عظیم الشان سبق دیتے ہیں حضرت علی کیلئے یہی مقدر تھا کہ وہ مسلمانوں میں ایک خطرناک اختلاف کے وقت اسلام کی کشتی کے ناخدا بنیں۔ اور گو اختلاف کے اندر انتظام کا سنبھالنا ایسا ہی دشوار ہے جیسا سمندر کے خطرناک تلاطم میں جہاز کو حالت سکون پر رکھنا لیکن ان دشواریوں کے اندر حضرت علی نے رسول امین کے خلق کا نمونہ دکھانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی باہمی لڑائیوں کے اندر مسلمانوں سے محبت اور رحم کا جو نمونہ حضرت علی نے دکھایا وہ اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ بڑا الزام آپ پر یہ دیا جاتا ہے کہ حضرت عثمان کے قاتلوں سے قصاص لینے کی آپ نے کوئی کارروائی نہیں کی اور نہ اس فتنہ کو مضبوط ہاتھ سے دبایا لیکن اول تو جیسا کہ دکھایا جا چکا ہے آپ خود مجبور تھے اور دوسرے یہ الزام اس صورت میں آپ پر آسکتا تھا کہ اپنے ساتھ مقابلہ کرنے والوں سے دوسری طرح پیش آتے اور اس فتنہ کو سختی کے ساتھ دباتے۔ خوارج کا فتنہ جس کے وہ آخر کار شکار ہوتے اس میں بھی آپ کا طرز عمل نرم رہا اور گو علانیہ بغاوت کو فرو کرنے کے لئے ان سے لڑائی بھی کرنی پڑی مگر آپ نے یہ پسند نہ کیا کہ چن چن کر ان فتنہ پردازوں کا خاتمہ کر دیتے۔ حضرت عثمان کی طرح آپ میں محبت اور نرمی کا پہلو غالب تھا اور اسی کے مطابق آپ کا دوستوں اور دشمنوں سب کے ساتھ سلوک تھا آپ کی فوج میں بیشک فتنہ پردازوں کا عنصر تھا اور آپ نے محمد بن ابوبکر کو جو قاتلین عثمان میں سے تھے مصر کا گورنر بھی مقرر کر دیا اور اشتر بھی آپ کے ساتھ رہا اگر انکو آپکی غلطیاں بھی تسلیم کر لیا جائے تو ہرج نہیں اسلئے کہ غلطی سے کون انسان خالی ہے لیکن غالباً اس بارہ میں بھی آپ کسی قدر مجبور تھے اور کسی قدر معاویہ کیطرف سے حالات مخالف کے پیش آنے نے آپکو اور مجبور کر دیا جس سے یہ الزام قوت پا گیا۔ کہ آپ قاتلین عثمان سے قصاص نہیں لینا چاہتے۔ ہاں دنیا کے مال و دولت کی آپ کے سامنے وہی وقعت رہی جو آپ سے پہلے تین بزرگوں کی نظر میں تھی اور اسی فقیرانہ زندگی کو آپ نے اپنا فخر سمجھا جو آپ رسول اللہ صلعم کی زندگی میں گذارتے بے غرضی اور بے نفسی آپکی زندگی کے اوراق کی ایک ایک سطر سے ظاہر ہے بادشاہت کے آپ طالب نہ تھے مگر جب اللہ تعالی نے یہ ذمہ داری آپ پر ڈالی تو ٹھیک رسول اللہ کے نقش قدم پر چل کر اپنی ذمہ داری کو پورا کیا یہاں تک کہ آخر جب ایک خلافت پر اتحاد آپ نہ کر سکے تو معاویہ کیساتھ صلح کر کے یہ بھی بتا دیا کہ جس قدر اتحاد اسلام کا قائم رہ سکتا ہے اسی کو قبول کر لیا جائے اگر بادشاہت کی ادنی خواہش بھی آپکے دل کے کسی کونہ میں ہوتی تو وفات تک معاویہ کیساتھ صلح کر کے سلطنت اسلام کے اتحاد کی نئی بنیاد نہ رکھ جاتے یہی آپکی صلح تھی جس نے آخر حضرت امام حسن کو آپ کے نقش قدم پر چلا کر اس بات پر آمادہ کیا کہ سلطنت سے بکلی دستبردار ہو کر اسلام کی پراگندہ طاقت کو پھر ایک کر دیا اور وہ اتحاد اسلام جسکو حضرت علی نے اس رنگ میں قائم ہوا۔ اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد وعلی خلفاء محمد

فہرست مضامین خلافت راشدہ